رفاقت علی شاہد

مرزا امان علی خاں غالبؔ لکھنوی

(اردو کا ایک اہم لیکن گم نام داستان نگار)

پس منظر:

''داستانِ امیر حمزہ'' اپنی مقبولیت اور خصوصیات کی بنا پر خالص اُردو کی چیز ہے۔ اس کا تصوّراتی ہیولا، اس کی خصوصیات، اس کی دل چسپی، اس کی انفرادیت اردو زبان کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ اس بے مثال داستان کی اصل یقیناً فارسی ہے لیکن وہاں اُسے وہ اہمیت اور انفرادیت حاصل نہیں جو اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ فارسی میں آج بھی یہ داستان محض چند سو صفحات کا قصّہ ہے، اسے داستان کا روپ اردو داستان نگاروں نے دیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے فارسی ''داستانِ امیر حمزہ'' کے آٹھ قلمی و مطبوعہ نسخوں کا ذکر کیا ہے[۱]۔ اس کے مقابلے میں اُردو داستان نگاروں نے آج سے تقریباً ایک صدی قبل تک اسے پچاسوں جلدوں اور ہزاروں صفحات میں پھیلا دیا۔ اُردو میں یہ کارنامہ سب سے پہلے رام پور اور پھر لکھنؤ میں انجام دیا گیا، ان کے علاوہ ''داستانِ امیر حمزہ'' سے متعلق متفرق داستانیں علاحدہ ہیں۔

اُردو میں ''قصۂ امیر حمزہ''[۲] کا قدیم ترین متن غالباً اس قلمی نسخے پر مبنی ہے جو انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانۂ خاص میں موجود ہے۔ یہ دکنی میں ہے اور قیاساً گیارھویں صدی ہجری مطابق اٹھارویں صدی عیسوی کا مکتوبہ ہے[۳]۔ اسی صدی کے اواخر کا مکتوبہ ایک اور قلمی نسخہ پیرس کے قومی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ کسی فرانسیسی اُردو داں کا ترجمہ ہے۔ یہ دونوں متون تاریخی اہمیت کے حامل تو ہیں لیکن ان کی ادبی اہمیت نہیں۔

اردو میں ''داستانِ امیر حمزہ'' کا پہلا اہم شاہ کار خلیل علی خاں اشکؔ کی مؤلفہ ''داستانِ امیر حمزہ'' ہے۔ اشکؔ کا نسخہ ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں تیار اور ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں کلکتے سے شائع ہوا۔ اُردو داں طبقے میں ''داستانِ امیر حمزہ'' کی مقبولیت اوّل اوّل اسی قصّے سے ہوئی۔ اس کی دوسری اہم کڑی مرزا امان علی خاں غالبؔ لکھنوی کا ''قصۂ امیر حمزہ'' ہے جو ۱۲۷۰۔۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں تیار اور ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں کلکتے سے شایع ہوا۔ یوں اردو میں ''داستانِ امیر حمزہ'' کی دو ابتدائی مطبوعہ روایتیں کلکتے میں تالیف اور شائع ہوئیں، لیکن تعجب خیز اور دل چسپ امر یہ ہے کہ اپنے اختصار اور خصوصیات کے باوصف یہ دونوں قصّے (خصوصاً نسخۂ غالبؔ لکھنوی) وہ قبولیت حاصل نہ کر سکے جس کے یہ مستحق تھے۔ اشکؔ کا قصّہ تو بعد میں بھی شائع ہوتا رہا لیکن غالبؔ لکھنوی کا قصّہ اشکؔ کے قصّے سے بہتر ہونے کے باوجود ایسا معدوم ہوا کہ جیسے اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو، تا آں کہ ایک صدی سے زائد کا عرصہ گذرنے کے بعد ڈاکٹر سہیل بخاری کے توسّط سے اس کی بازیافت ہوئی[۵] اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ اس قصّے کے مطبوعہ نسخے از حد کم یاب ہیں۔ معلومات کے مطابق دنیا بھر میں اس کے صرف دو (۲) نسخوں کا علم ہو سکا ہے۔

۱۸۷۰ء کے آس پاس منشی نول کشور نے ''قصّۂ امیر حمزہ'' کی دلچسپی اور مقبولیت کی وجہ سے اس کی اشاعت کی جانب خصوصی توجہ کی، چناں چہ ۱۸۷۱ء میں انھوں نے اپنے ''مطبع اَودھ اخبار، لکھنؤ'' سے ''قصّۂ امیر حمزہ'' کا وہ نسخہ شائع کیا جسے مولوی عبداللہ بلگرامی نے غالبؔ لکھنوی کے متن پر نظرِ ثانی کر کے تیار کیا تھا[۶]۔ ۱۸۸۷ء سے قبل یعنی ۱۵، ۱۶ سال میں اس نسخے کی تین (۳) طباعتیں ہوئیں۔ اس سے عوام میں ''قصّۂ امیر حمزہ'' کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے منشی نول کشور نے ۱۸۸۰ء کے قریب ''داستانِ امیر حمزہ'' (طویل) کی داغ بیل ڈالی اور اس سلسلے میں ''طلسمِ ہوش ربا'' کی تالیف کے لیے منشی محمد حسین جاہؔ کو ملازم رکھا جن کی تالیف کی ہوئی ''طلسمِ ہوش ربا'' کی جلد اوّل اُنھوں نے اپنے مطبع سے ۱۸۸۴ء میں شائع کی[۷]۔ ۱۸۸۷ء میں مطبع منشی نول کشور سے ''قصّۂ امیر حمزہ'' کی چوتھی طباعت منظرِ عام پر آئی۔ اس پر مصحّح کے طور پر سید تصدق حسین [رضوی] کا نام درج ہے۔ اس نسخے کی خاص بات یہ ہے کہ اسے تصدّق حسین [رضوی] نے عبداللہ بلگرامی کے متن میں ترمیم و اصلاح کے بعد تیار کیا تھا[۸]۔ بعد میں مولوی عبدالباری آسیؔ نے تصدق حسین [رضوی] کے نسخے پر نظرِ ثانی کی۔ یہ نسخہ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں مطبع منشی نول کشور سے ہی شایع ہوا۔ یک جلدی ''داستانِ امیر حمزہ'' کی دسویں طباعت اسی

ادارے (تب تیج کمار پریس، لکھنؤ) سے ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ یہ نسخۂ آسی کی اشاعت تھی۹۔

یک جلدی ''قصۂ امیر حمزہ'' کی اس اشاعتی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مختصر روایت کے اہم نسخے اشکؔ اور غالبؔ لکھنوی کے قصّے ہیں، اور ان میں بھی غالبؔ لکھنوی کا نسخہ زیادہ مقبول رہا کہ تین (۳) افراد: مولوی عبداللہ بلگرامی، سیّد تصدق حسین رضوی اور مولوی سیّد عبدالباری آسیؔ نے اس چراغ سے اپنے اپنے چراغ جلائے۔

(۲)

نام و تخلص:

غالبؔ لکھنوی کا اصل نام ''امان علی خاں'' ہے جو انھوں نے اپنی تصانیف میں خود لکھا ہے۱۰۔ ''قصۂ امیر حمزہ'' کے صفحۂ آغاز پر اُنھیں ''نواب مرزا امان علی خاں بہادر لکھنوی'' لکھا ہے۔ قدیم تذکروں میں بھی اُن کا پورا نام ''مرزا امان علی خاں'' تحریر ہے۱۱۔

تمام مآخذ میں اُن کا تخلص ''غالبؔ'' ملتا ہے۔ اس کی تصدیق خود اُن کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ''داستانِ عشّاق'' کے دیباچے میں انھوں نے خود کو ''غالبؔ تخلص'' لکھا ہے۱۲۔ نساخؔ نے اُن کے چار شعر اور ارمانؔ نے دو شعر اپنے اپنے تذکروں میں نمونے کے طور پر درج کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ غالبؔ لکھنوی اردو میں شاعری بھی کرتے تھے۔

وطن:

غالبؔ لکھنوی کے وطن کے بارے میں دو مختلف آرا ملتی ہیں۔ ارمانؔ کے مطابق وہ: ''باشندے عظیم آباد کے'' تھے۱۳۔ نساخؔ نے بھی اُنھیں ''عظیم آبادی'' لکھا ہے۱۴۔ ان کی تقلید میں رازؔ بلخی اور احمد اللہ ندوی نے بھی اُنھیں عظیم آبادی تحریر کیا ہے۱۵۔ اس سلسلے میں خود غالبؔ لکھنوی کا بیان ہے: ''رہنے والا دارالسلطنت لکھنو کا''۱۶۔ اس سے قاضی عبدالودود نے درج ذیل نتیجہ اخذ کیا:

> ''امان علی خاں غالبؔ خود اپنے کو لکھنوی کہتے ہیں، لیکن نساخؔ نے ''سخنِ شعرا'' میں اُنھیں عظیم آبادی لکھا ہے۔ اصلاً یہ لکھنوی ہوں گے مگر ان کا قیام مدتوں کلکتے میں رہا..... آخر عمر میں عظیم آباد آ گئے ہوں تو عجب نہیں''۱۷۔

قاضی صاحب کا یہ لکھنا تو باور کیا جا سکتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی اصلاً لکھنوی ہوں گے لیکن اس کے کوئی شواہد نہیں کہ وہ آخر عمر میں عظیم آباد چلے گئے ہوں کیوں کہ ارمانؔ اور نساخؔ نے اُنھیں عظیم آبادی لکھا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل حقائق بھی پیشِ نظر رہنے چاہئیں:

(الف) یہ اظہر من الشمس ہے کہ انسان کا پہلا اور قدیم تعلق اُس کی پہچان بنتا ہے، یا پھر جہاں کسی کی اقامت طویل عرصے تک رہی ہو، اس علاقے سے بھی اُس کی نسبت مشہور ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اگر آخری دور میں عظیم آباد میں رہنے کی وجہ سے غالبؔ عظیم آبادی کہلا سکتے تھے تو اس سے قبل لکھنؤ اور کلکتے میں رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے اُن کی لکھنوی اور بنگالی نسبت زیادہ لازمی ہے۔

(ب) غالبؔ لکھنوی کے عظیم آبادی اور لکھنوی ہونے کا جھگڑا ارمانؔ اور نساخؔ کے تذکروں کی تالیف (بالترتیب ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء تا ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء اور ۱۲۸۱ھ مطابق ۶۵-۱۸۶۴ء) کے وقت کا ہے۔ اُس وقت غالبؔ لکھنوی کی لکھنؤ میں (بقولِ خود) اور کلکتے میں (بقولِ ارمانؔ و نساخؔ) طویل اقامت کے شواہد تو موجود ہیں لیکن اُن کی عظیم آباد میں رہائش یا اقامت کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ اس صورت میں قاضی صاحب کے قیاس کے مطابق غالبؔ لکھنوی کی عظیم آباد میں رہائش کا زمانہ لکھنؤ اور کلکتے کی اقامت کے بعد کا ہونا چاہیے، یعنی کم سے کم ۱۸۶۵ء کے بعد کا؛ لیکن اسے درست تسلیم کرنے میں دو قباحتیں ہیں: اوّل یہ کہ ۱۸۶۵ء کے بعد غالبؔ لکھنوی کی عظیم آباد میں رہائش اختیار کرنے کا کوئی ثبوت موجود نہیں اور دوسرے یہ کہ ارمانؔ نے ۱۸۵۴ء سے قبل اور نساخؔ نے ۱۸۶۵ء سے قبل غالبؔ لکھنوی کو عظیم آبادی لکھا ہے۔ اس صورت میں غالبؔ لکھنوی کا عظیم آباد سے تعلق لازمی طور پر ۱۸۵۴ء سے قبل کا واقعہ ہونا چاہیے، نہ کہ بعد کا، اور جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ اس سنہ سے قبل غالبؔ لکھنوی کی لکھنؤ اور کلکتے میں رہائش کے شواہد تو موجود ہیں لیکن عظیم آباد میں رہائش یا اقامت اختیار کرنے کے شواہد نہیں ملتے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی کا عظیم آباد سے تعلق کا زمانہ ارمانؔ اور نساخؔ کے بیانات کے مطابق لازمی طور پر ۱۸۵۴ء سے قبل کا بنتا ہے۔

اگرچہ غالبؔ لکھنوی نے خود کو ''لکھنوی'' لکھا ہے اور ''قصۂ امیر حمزہ'' کے صفحۂ آغاز (ص ا) پر بھی اُنھیں ''لکھنوی'' لکھا گیا ہے، لیکن اس سلسلے میں ارمانؔ اور نساخؔ کے بیانات بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ دونوں غالبؔ لکھنوی کے معاصر ہیں۔ ارمانؔ کا تذکرہ کلکتہ میں لکھا گیا اور اس وقت غالبؔ لکھنوی بھی کلکتے میں موجود تھے، کیوں کہ ارمانؔ کا بیان ہے کہ وہ کچھ عرصے سے کلکتے میں آ گئے ہیں۔ اسی طرح نساخؔ بھی غالبؔ لکھنوی سے واقف تھے۔ انھوں نے اُن سے ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے، اس لیے ارمانؔ اور نساخؔ کے بیانات قابلِ توجہ اور مستند ہیں اور دونوں نے بالالتزام

غالبؔ لکھنوی کو عظیم آبادی تحریر کیا ہے۔

درج بالا تناظر میں خود غالبؔ لکھنوی اور اُن کے بارے میں ارمانؔ اور نساخؔ کے بیانات بظاہر ایک دوسرے کے متغائر نظر آتے ہیں لیکن دونوں میں کوئی ربط ضرور ہونا چاہیے، کیوں کہ دونوں بیانات مستند اور صحیح ہیں۔ اس کی توجیہ یہی ہوسکتی ہے کہ غالبؔ لکھنوی کی پیدائش عظیم آباد کی ہو اور بعد میں کسی وقت وہ لکھنؤ میں منتقل ہوگئے ہوں۔ یہ ایسی بات ہے جو عام طور پر مشہور نہیں ہوتی اور ذاتی طور پر واقف افراد ہی اس سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ارمانؔ اور نساخؔ کا غالبؔ لکھنوی سے تعلق اور واسطہ اوپر بیان ہو چکا ہے، پھر دونوں نے اپنے تذکروں کے لیے غالبؔ لکھنوی کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل بھی کی ہوں گی، اس لیے دونوں اس امر سے واقف ہوں گے کہ غالبؔ لکھنوی کی اصل عظیم آبادی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی کی پرورش و پرداخت اور تعلیم وغیرہ لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اس کے تین واضح قرینے موجود ہیں۔ اوّل: غالبؔ لکھنوی کا خود کو ''لکھنؤ کا رہنے والا'' لکھنا، دوسرے: ''قصّۂ امیر حمزہ''، مطبوعہ کلکتہ کے سرِ ورق پر اُنھیں ''لکھنوی'' لکھنا، تیسرے: اُن کے قصّے اور داستانوں کی زبان و بیان میں لکھنوی زبان و بیان کے اوصاف کی موجودگی بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان کے مصنف کی زبان کی تراش خراش لکھنؤ میں ہوئی ہے۔ ان میں سب سے مضبوط حوالہ خود غالبؔ لکھنوی کا ہے۔ ظاہر ہے عظیم آبادی نسبت اُن کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں لکھنؤ کا حصّہ زیادہ اور اہم رہا ہوگا، اسی لیے وہ خود کو عظیم آبادی لکھنے کے بجائے ''لکھنوی'' تحریر کرنا مقدم سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد کلکتہ سے شائع ہونے والے اُن کے ''قصّۂ امیر حمزہ'' کے سرِ ورق کی عبارت کا نمبر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ سے دُور ہو کر بھی اُن کی شہرت ''لکھنوی'' ہونے کے حوالے سے تھی، گویا غالبؔ کی لکھنوی نسبت اتنی راسخ اور معروف ہو چکی تھی کہ لکھنؤ سے دوری نے بھی اسے نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ عظیم آبادی نسبت پر لکھنوی نسبت کی فوقیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ''امان علی خاں'' کو غالبؔ لکھنوی بنانے میں لکھنؤ کا کردار کلیدی ہے۔

حالاتِ زندگی:

''قصّۂ امیر حمزہ'' کے سرِ ورق پر اُن کا پورا نام ''نواب مرزا امان علی خاں بہادر لکھنوی'' درج ہے، قصّے کے دیباچے میں غالبؔ لکھنوی نے خود کو ''داماد شاہ زادہ فتح حیدر خلفِ اکبر جنت نشاں ٹیپو سلطان'' لکھا ہے[۱۸]۔ ان دونوں بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی خاصے آسودہ

حال شخص تھے۔ ''نواب'' سے یہی ظاہر ہوتا ہے، اس کے علاوہ شہزادہ فتح حیدر کی دامادی بھی کسی کم حیثیت آدمی کو نصیب نہیں ہوسکتی تھی۔ ''بہادر'' غالباً اُن کا خطاب ہوگا، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی کی سماجی حیثیت عام افراد سے برتر تھی اور وہ خاصے متمول تھے۔

غالبؔ لکھنوی نے ''قصۂ امیر حمزہ'' کے دیباچے میں خود کو شہزادہ فتح حیدر خلفِ اکبر ٹیپو سلطان کا داماد لکھا ہے۔ ''قصۂ امیر حمزہ'' ۱۸۵۴ء/۱۲۷۱ھ میں تالیف ہوا، گویا اُن کی ٹیپو سلطان کے خاندان میں دامادی کا واقعہ ۱۸۵۴ء یا اس سے قبل کا ہے۔ ارمانؔ کے مطابق ۱۸۵۴ء میں وہ کلکتہ میں منتقل ہو چکے تھے، اس لیے واضح نہیں کہ اُن کی دامادی فتح حیدر کا واقعہ لکھنؤ میں پیش آیا یا کلکتے میں۔ کوشش کے باوجود کسی اور ماخذ میں ٹیپو سلطان کے افرادِ خاندان کے ذیل میں غالبؔ لکھنوی کے حالات یا ذکر نہیں ملا، اس لیے اُن کی خاندانِ ٹیپو سلطان میں قرابت داری کے سلسلے کی مزید تفصیلات سے ہم بے خبر ہیں۔

نساخؔ نے لکھا ہے کہ غالبؔ لکھنوی ''مدت تک ڈپٹی کلکٹر تھے'' (۱۹)۔ اُن کی تقلید میں رازؔ بلخی اور احمد اللہ ندوی نے بھی یہی لکھا ہے'' ۲۰۔ نساخؔ نے یہ واضح نہیں کیا کہ وہ کہاں ڈپٹی کلکٹر رہے؟ البتہ نساخ کے اس بیان سے دو اوامر طے ہو جاتے ہیں: اوّل یہ کہ نساخؔ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اُنھوں نے غالبؔ لکھنوی کا ترجمہ اپنے تذکرے میں شامل کیا، اُس سے پہلے ہی غالبؔ لکھنوی کی ڈپٹی کلکٹری کا زمانہ گزر چکا تھا، گویا غالبؔ لکھنوی زیادہ سے زیادہ ۱۸۶۴ء سے پہلے ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ یا تو چھوڑ چکے تھے یا اس سے سبک دوش ہو چکے تھے۔ دوسرے: اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی اعلا تعلیم یافتہ تھے اور انگریزی زبان سے بھی کماحقہٗ واقف تھے، کہ ان لوازمات کے بغیر ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ ملنا ممکن نہیں تھا۔

غالبؔ لکھنوی کے ڈپٹی کلکٹری کے زمانے سے متعلق قیاس سے کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کے شواہد دیکھیے:

(الف): ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت (سے قبل) یعنی ۱۸۵۷ء تک موجود نہیں تھا۔ یہ انتظامی عہدہ ہندوستان پر انگلستان کی حکومت کے زمانے یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۸۵۸ء کے نفاذ کے بعد وجود میں آیا، اس لیے غالبؔ لکھنوی یقیناً ۱۸۵۷ء کے بعد ڈپٹی کلکٹر بنے ہوں گے۔

(ب): ارمانؔ نے اپنے تذکرے میں غالبؔ لکھنوی کی ڈپٹی کلکٹری کا ذکر نہیں کیا۔ ارمانؔ اور غالبؔ لکھنوی ایک ہی شہر میں رہتے تھے اور غالبؔ لکھنوی کا ترجمہ سب سے پہلے ارمانؔ ہی نے

اپنے تذکرے میں شامل کیا، اس لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ارمانؔ جہاں غالبؔ لکھنوی کے اور حالات لکھ سکتے تھے تو اُن کی ڈپٹی کلکٹری کی بابت لکھنے میں انھیں کیا امر مانع تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ارمانؔ کے تذکرے کی تکمیل ۱۸۵۴ء تک غالبؔ لکھنوی ابھی ڈپٹی کلکٹر نہیں ہوئے تھے۔ اس کا ایک اور قرینہ یہ بھی ہے کہ خود غالبؔ لکھنوی نے بھی اپنی داستانوں: ''قصۂ امیر حمزہ'' اور ''داستانِ عشاق'' میں اپنے اس عہدے کا ذکر نہیں کیا۔

ان دونوں شواہد سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی کی ڈپٹی کلکٹری کا زمانہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۴ء کے درمیان ہوگا۔ اس زمانے میں غالبؔ لکھنوی کی رہائش کلکتے میں تھی، اس لیے یہ ڈپٹی کلکٹری بھی اسی شہر سے متعلق ہونی چاہیے۔ اب دیکھیے کہ نساخؔ نے اُن سے ''چندر نگر عرف فرانسڈانگا''[۲۱] میں ملاقات ہونے کا لکھا ہے[۲۲]، ہوسکتا ہے غالبؔ لکھنوی اسی علاقے میں اپنا ڈپٹی کلکٹری کا دفتر کرتے ہوں۔

غالبؔ لکھنوی کی ڈپٹی کلکٹری سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھیں انگریزوں کے حلقے میں بار حاصل تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جس طرح عام مسلمان عمائد پر انگریزوں نے بے اعتباری کا اظہار کیا، اُنھیں اعلا سرکاری ملازمتوں سے دُور رکھا اور صرف اُنھی مسلمانوں کو اعلا عہدوں سے نوازا جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اُن کا ساتھ دیا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر غالبؔ لکھنوی کو ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ مل جانا اس اَمر کی نشان دہی کرتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے دوران اُن کا تعلق انگریزوں کے ساتھ بنا رہا اور مسلمان ہونے کے باوجود انگریز اُنھیں قابلِ اعتبار اور ڈپٹی کلکٹری کا اہل سمجھتے تھے۔ ہوسکتا ہے اس اعلا عہدے کے حصول میں خاندانِ ٹیپو سلطان سے وابستگی یا اُن کی طرف سے عملی مدد بھی غالبؔ لکھنوی کو حاصل رہی ہو۔

غالبؔ لکھنوی کے ہندو سے مسلمان ہونے کا تذکرہ بھی نساخؔ[۲۳] کے علاوہ کسی نے نہیں کیا، لیکن نساخؔ کا حوالہ معتبر ہے اور نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نساخؔ نے سُنی سنائی بات لکھ دی ہو، کیوں کہ اگر خود غالبؔ لکھنوی سے اُنھیں اس کی اطلاع ہوتی تو غالبؔ لکھنوی اسے اپنی کتابوں کے دیباچوں میں بھی بیان کرتے، جیسے اُنھوں نے اپنے دیگر حالات درج کیے ہیں۔ سُنی سنائی بات میں التباس کا بھی امکان رہتا ہے اور غالبؔ لکھنوی کے سلسلے میں نساخؔ اس التباس کا شکار ہوئے ہیں (اس کی تفصیل آگے آتی ہے)۔ معلوم ہوتا ہے غالبؔ لکھنوی کے ہندو سے مسلمان ہونے کے سلسلے میں بھی نساخؔ کو التباس ہوا ہے۔

غالبؔ لکھنوی کا اپنے بارے میں کہنا ہے کہ ''رہنے والا دارالسلطنت لکھنؤ کا'' ۲۴؎ ارمانؔ نے لکھا ہے کہ وہ ''چند مدّت سے کلکتہ میں آ رہے ہیں'' ۲۵؎۔ اس سے معلوم ہوا کہ غالبؔ لکھنوی کا قیام پہلے لکھنؤ میں تھا، بعد میں وہ کلکتے میں منتقل ہو گئے۔ ارمانؔ کا تذکرہ ۱۸۵۴ء میں مکمل ہوا، ''چند مدت'' کو اگر دو سال فرض کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۲ء کے آس پاس غالبؔ لکھنوی، کلکتے میں منتقل ہوئے۔

رازؔ بلخی اور اُن کی تقلید میں احمد اللہ ندوی نے لکھا ہے کہ غالبؔ لکھنوی نے آخر عمر میں کلکتے میں سکونت اختیار کر لی تھی ۲۶؎۔ اس سے بظاہر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی وفات تک کلکتے ہی میں مقیم رہے، لیکن رازؔ بلخی کا بیان مستند نہیں۔ اُن کا تذکرہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا، یعنی تذکرۂ نساخؔ سے تقریباً ۶۰ سال بعد، اور انھوں نے اس اطلاع کے لیے اپنا ماخذ بھی تحریر نہیں کیا، اس لیے اُن کا بیان تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ رازؔ بلخی کا ماخذ بظاہر نساخؔ کا ''سخنِ شعرا'' ہے جس میں غالبؔ لکھنوی کے ''مدت سے'' کلکتے میں آ رہنے کی بابت لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بیان سے رازؔ بلخی نے اندازہ قائم کیا کہ آخر عمر تک غالبؔ لکھنوی یہیں رہے ہوں گے، اس لیے اُنھوں نے یہ بات تیقّن سے لکھ دی۔ اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں کہ رازؔ بلخی کو غالبؔ لکھنوی کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہوئی ہوں گی، کیوں کہ غالبؔ لکھنوی کے بارے میں اُن کی معلومات نساخؔ ہی سے مستعار ہیں، اس لیے نہ تو رازؔ بلخی کے بیان کو درست تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ اندازہ قائم ہو سکتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی آخر عمر تک کہاں قیام پذیر رہے اور اُن کی وفات کہاں ہوئی۔

غالبؔ لکھنوی کے بیٹے نوروز علی خاں یکتاؔ کے متعلق رازؔ بلخی نے کچھ زائد معلومات مہیا کی ہیں جن میں ۱۸۷۸ء میں اُس کی وفات اور محلّہ دیوان، عظیم آباد میں رہائش کا لکھا ہے ۲۷؎۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی کا قیام بھی یہیں ہوگا، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ باور کر لیا جائے کہ غالبؔ لکھنوی اور یکتاؔ، یعنی باپ بیٹا آخر تک اکٹھے رہے۔ ظاہر ہے اس کا کوئی ثبوت یا کم سے کم قرینہ موجود نہیں، لہٰذا یہ قیاس قائم کرنا بھی ممکن نہیں۔

نساخؔ وہ آخری تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے غالبؔ لکھنوی کو زندہ دیکھا۔ نساخؔ نے اپنا تذکرہ ۱۲۸۱ھ/۶۵-۱۸۶۴ء میں مکمل کیا، گویا یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کم سے کم ۱۸۶۴ء تک غالبؔ لکھنوی زندہ تھے۔ اُن کی وفات کب اور کہاں ہوئی، اس سے متعلق کوئی معلومات دست یاب نہیں۔

متعلقین:

غالبؔ لکھنوی نے ''قصۂ امیر حمزہ'' کے دیباچے میں خود کو شاہ زادہ فتح حیدر خلف ٹیپو سلطان کا داماد لکھا ہے۲۸۔ اس سے اُن کی اہلیہ کی شخصیت سے متعلق علم ہوتا ہے۔ ''داستانِ عشاق'' کے دیباچے میں اُنھوں نے اپنے بیٹے نوروز علی خان، یکتاؔ تخلص کا تذکرہ کیا ہے۲۹۔ رازؔ بلخی نے یکتاؔ کے بارے میں مزید معلومات دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اُن کا قیام عظیم آباد، محلّہ دیوان میں تھا اور ان کا انتقال ۱۸۷۸ء میں ہوا۔ رازؔ نے اُنھیں صاحبِ دیوان اور صاحبِ تلامذہ بھی لکھا ہے اور نمونے کے طور پر اُن کے دو (۲) اُردو شعر بھی درجِ تذکرہ کیے ہیں۳۰۔ نساخؔ لکھتے ہیں: ''ان میں ایک بڑا عیب ہے کہ دوسرے شاعروں کے شعر اپنے نام سے پڑھتے ہیں'' اور نمونے میں ذیل کا شعر درج کیا ہے:

سیارے ہیں ثابت تری جوتی کے ستارے
روشن ہے مہ و مہر سے گردوں کی پڑی آنکھ ۳۱

ان معلومات سے علم ہوا کہ نوروز علی خاں یکتاؔ اردو کے شاعر تھے۔ اُن کی وفات کا سنہ رازؔ بلخی نے درج کیا ہے لیکن حسبِ معمول اس کے لیے اپنا ماخذ تحریر نہیں کیا۔ بہر حال، اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ ''سخنِ شعرا'' میں اُن کا ذکر زندہ شخص کے طور پر ہوا ہے، گویا ''سخنِ شعرا'' کی تالیف ۱۲۸۱ھ مطابق ۶۵۔۱۸۶۴ء تک یکتاؔ لازمی طور پر زندہ تھے۔ غالبؔ لکھنوی نے ''داستانِ عشاق'' کے دیباچے میں یکتاؔ کی فرمائش پر ''ترجمۂ خاورنامہ'' کی تالیف کا ذکر کیا ہے، گویا ''داستانِ عشاق'' کی تکمیل (۲۰؍رجب ۱۲۷۱ھ مطابق ۸؍اپریل ۱۸۵۴ء) سے کچھ پہلے ''ترجمۂ خاورنامہ'' کی تالیف کے وقت یکتاؔ کی عمر اتنی ضرور تھی کہ باپ سے کسی کتاب کی تالیف کے لیے فرمائش کر سکتے۔ اگر یہ عمر بیس بائیس سال فرض کر لی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یکتاؔ کی پیدائش ۱۸۳۰ء کے آس پاس ہوئی ہوگی۔

بیوی اور بیٹے کے علاوہ غالبؔ لکھنوی کے متعلقین میں سے کسی اور کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ اسی طرح اُن کے آباواجداد کے بارے میں بھی کسی ذریعے یا ذرائع سے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

غالبؔ لکھنؤی اور مرزا غالبؔ دہلوی:

مرزا غالبؔ نے اپنی خاندانی پنشن میں اضافے کے لیے ۱۸۲۶ء سے ۱۸۲۹ء تک کلکتے کا

سفر کیا۔ کلکتے میں قیام کے دوران اُن کے حامیانِ قتیلؔ سے ادبی معرکے ہوئے ۳۲۔ ان معرکوں میں مخالفینِ غالبؔ کے ناموں میں ایک نام غالبؔ لکھنوی کا بھی لیا جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ حمید احمد خاں نے ۱۹۵۰ء میں ''غالبؔ کا کلکتہ'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ۳۳۔ اس مضمون میں اُنھوں نے لکھا:

> ''...قتیلؔ کی زبان دانی کی بحث میں ایک ایسا جھگڑا کھڑا ہوگیا ...اس قضیے کو یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں، ''یادگارِ غالب'' میں مولانا حالیؔ اور خود غالبؔ نے اپنے مکاتیب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے، البتہ ایک چیز، جس کا ذکر مولانا حالیؔ اور خود مرزا غالبؔ نے بھی نہیں کیا، یہ ہے کہ معترضین میں سب سے زیادہ بلند بانگ ایک صاحب نواب زادہ مرزا امان علی خاں تھے۔ یہ بھی غالبؔ تخلص کرتے تھے، عظیم آباد کے رہنے والے تھے اور کچھ عرصہ پہلے کلکتہ میں آرہے تھے''۔ ۳۴

اس کے بعد حمید احمد خاں نے میر وزیر علی عبرتیؔ عظیم آبادی نے غیر مطبوعہ تذکرے ''ریاض الافکار'' سے غالبؔ کے متعلق ایک عبارت نقل کی ہے جس میں مرزا امان علی خاں کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ بقولِ حمید احمد خاں ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں تحریر ہوا ۳۵ اور اس کے جس قلمی نسخے سے حمید احمد خاں نے استفادہ کیا، وہ نیشنل لائبریری، کلکتہ کے بوہار کلکشن ۳۶ میں موجود تھا۔ متعلقہ عبارت درج ذیل ہے:

> ''...مرزا اسد اللہ خاں... بہ تقریبے از وطنِ مالوف بہ کلکتہ پیوستہ۔ مذاق ناشناسانِ کلکتہ بر سیفِ لسانی و موشگافی آں سخن رس نکتہ پیوند، خارِ حسرت در دل ہا شکستہ در صدرِ آویزش بہ آں مغتنمِ روزگار گشتند، خصوصاً مرزا امان علی خاں کہ اصلا بہ آں مستعدِ روزگار جادو بیاں نسبتے ندارد''۔ ۳۷

حمید احمد خاں کی تقلید میں وفاؔ راشدی نے بھی غالبؔ لکھنوی کو معترضینِ غالبؔ میں شامل کیا ہے۔ اُن کے مطابق اس مخالفت میں مرزا امان علی خاں نے اپنا تخلص بھی ''غالبؔ'' رکھ لیا اور کلامِ غالبؔ کے پُرزے اُڑانے لگے ۳۸۔

غالبؔ لکھنوی کے معترضینِ غالبؔ میں شامل ہونے کے بارے میں (سب سے پہلے) صرف حمید احمد خاں اور وفاؔ راشدی نے لکھا ہے۔ حمید احمد خاں کے پاس تو چلیں ایک معاصر تذکرے کی شہادت موجود تھی، لیکن وفاؔ راشدی کے دونوں الزامات میں کوئی حقیقت نہیں۔ ان الزامات کے

لیے اُن کے پاس کوئی شہادت یا ثبوت بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں اُنھوں نے اپنی طرف سے لکھ دی ہیں۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے بھی حمید احمد خاں کی معلومات کو دُہرایا ہے اور مضمون کے حاشیے میں غالبؔ لکھنوی کے حالات حکیم احمد اللہ ندوی کی کتاب سے نقل کر دیے ہیں ۳۹۔ ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے عبرتیؔ کے دو تذکروں: ''ریاض الافکار'' اور ''معراج الخیال'' کے بیانات کو بنیاد بنا کر واضح کیا ہے کہ ''امان علی خاں نے برسرِ مشاعرہ غالبؔ پر اعتراض کیا تھا''۔ ۴۰

حمید احمد خاں اور ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے معاصر مآخذ یعنی عبرتیؔ کے تذکروں سے استفادہ کیا ہے، اس لیے اُن کے اس بیان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہنگامۂ کلکتہ کے دوران امان علی خاں معترضینِ غالبؔ میں شامل تھے، لیکن کیا یہ ''امان علی خاں، غالبؔ لکھنوی'' ہی تھے؟ کیا معترضِ غالبؔ کا نام ''امان علی خاں'' ہونے سے یہ طے ہو جاتا ہے کہ وہ غالبؔ لکھنوی ہی ہوں گے، کیوں کہ اُن کا نام ''امان علی خاں'' ہی ہے؟ اس سلسلے میں درج ذیل اُمور پیشِ نظر رہنے چاہئیں:

(الف) غالبؔ کا معارضۂ کلکتہ ۱۸۲۸ء کا واقعہ ہے، جب کہ غالبؔ لکھنوی ۱۸۵۵ء میں ''قصّۂ امیر حمزہ'' کی اشاعت کے ذریعے ادبی دنیا میں نمودار ہوتے ہیں۔ اگر معترضِ غالبؔ امان علی خاں، غالبؔ لکھنوی ہی تھے تو ۲۶، ۲۷ برس تک کہاں چھپے بیٹھے رہے؟

(ب): جیسا کہ اوپر تفصیل گزر چکی ہے کہ کلکتے میں مستقل قیام سے پہلے غالبؔ لکھنوی کا قیام لکھنؤ میں تھا۔ کلکتے میں غالبؔ لکھنوی کی ۱۸۵۰ء کے آس پاس آمد کا ذکر بھی تفصیل سے ہو چکا ہے۔ اب اگر غالبؔ لکھنوی کو معترضِ غالبؔ مانا جائے تو لازم آتا ہے کہ وہ ۱۸۲۸ء میں کلکتے میں موجود ہوں یا پھر وہ لکھنؤ سے خاص طور پر غالبؔ کی مخالفت کے لیے کلکتے آئے ہوں۔ ظاہر ہے یہ دونوں اوامر درست نہیں، خصوصاً دوسرا امر لغو ہے۔ اُسے ماننے کی صورت میں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کلکتے میں غالبؔ کی مخالفت ایک سوچا سمجھا اور خاصا مشقت طلب منصوبہ تھا جس میں شریک ہونے کے لیے غالبؔ لکھنوی کو لکھنؤ سے طویل فاصلہ طے کر کے کلکتے جانا پڑا۔

(ج): غالبؔ نے اپنے معارضۂ کلکتہ کی تفصیل اپنے خطوط میں کئی جگہ بیان کی ہے اور متعلقہ افراد کے نام بھی لکھے ہیں، لیکن غالبؔ لکھنوی کا ذکر اُن کے ہاں مطلق نہیں ہوا۔ فطری طور پر اپنے ہم تخلص مخالف کو غالبؔ ضرور رگیدتے، اپنی عادت کے مطابق اُس پر طنز کے تیر برساتے اور اُس کا مذاق اُڑاتے لیکن غالبؔ تو اُن کا ذکر تک نہیں کرتے۔

(د): ارمانؔ اور نساخؔ نے اپنے اپنے تذکرے غالبؔ کے معارضۂ کلکتہ کے بعد ترتیب

دیے۔ دونوں تذکرہ نگار غالبؔ لکھنوی اور غالبؔ دہلوی سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان دونوں نے غالبؔ لکھنوی کے بارے میں جو معلومات درج کی ہیں، وہ کسی اور معاصر تذکرہ نگار کے ہاں نہیں ملتیں۔ نساخؔ تو غالبؔ لکھنوی سے مل بھی چکے تھے۔ اگر معارضۂ غالبؔ میں غالبؔ لکھنوی کسی نہ کسی حیثیت سے شامل ہوتے تو دونوں یا کم سے کم دونوں میں سے کوئی ایک تذکرہ نگار اس کا ذکر ضرور کرتا۔ معارضۂ غالبؔ کوئی عام یا نظر انداز کیے جانے والا واقعہ نہیں تھا، بل کہ ایک اہم ادبی واقعہ تھا۔ دونوں تذکرہ نگاروں کا غالبؔ لکھنوی کے ذکر میں اس معارضے کا ذکر نہ کرنا یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ غالبؔ لکھنوی معارضۂ غالبؔ میں شامل نہیں تھے۔

(ہ): معترضِ غالبؔ: ''امان علی خاں'' کہیں شاگردِ قتیلؔ ''میر امان علی'' تو نہیں، جس کا ذکر اس سے پہلے گذر چکا ہے؟ ہوسکتا ہے اس کا پورا نام ''میر امان علی خاں'' ہو یا پھر نام ''میر امان علی'' ہی ہو لیکن عبرتیؔ عظیم آبادی تک نام صحیح نہ پہنچا ہو۔

(و): عبرتیؔ نے واضح کیا ہے کہ وہ معارضۂ کلکتہ کی محفلوں میں شریک نہ ہوسکے لیکن غالبؔ کی نظم و نثر اُنھیں میر ذوالفقار علی سے حاصل ہوگئی۔ عبرتیؔ کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

''ہر چند من محررِ اوراق را دولتِ ہم بزمیِ آں جانِ سخن نصیب نہ گشت مگر پارۂ نظم و نثرِ آں خوش تلاش کہ از بیاضِ مُشفقی میر ذوالفقار علی صاحب بہ چشمِ درآمد۔۔۔''[۴۱]

جب عبرتیؔ ان معارضوں کے چشم دید ہی نہیں تو ظاہر ہے، اُن تک سنی سنائی اطلاعات پہنچی ہوں گی اور سُنی سنائی باتوں کا اعتبار معلوم! اس طرح عبرتیؔ کا معاصر بیان بھی نا قابلِ اعتبار ٹھہرتا ہے۔

(ز): معارضۂ کلکتہ ۱۸۲۸ء کا واقعہ ہے، جب کہ حمید احمد خاں کے مطابق تذکرۂ ''ریاض الافکار'' ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا، گویا معارضۂ کلکتہ کے ۲۶ سال بعد۔ اب یہ واضح نہیں کہ اتنے عرصے بعد عبرتیؔ کو معترضِ غالبؔ میں غالبؔ لکھنوی کے شامل ہونے کی اطلاع کہاں سے حاصل ہوئی۔ اندازہ ہے کہ سینہ بہ سینہ روایات اور سُنی سنائی باتیں ہی اس کی بنیاد ہوں گی، گویا عبرتیؔ کا بیان بھی اپنی وقعت کھو دیتا ہے۔

(ح): غالبؔ لکھنوی نے ''قصۂ امیر حمزہ'' اور ''داستانِ عشّاق'' کے دیباچوں میں اپنے اور اپنے احباب کا تذکرہ التزاماً کیا ہے، لیکن کہیں بھی اُنھوں نے غالبؔ یا معارضۂ کلکتہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ فطری طور پر اُنھیں غالبؔ کی مخالفت اور اپنے حق پر ہونے کا پراپیگنڈہ کرنا چاہیے تھا۔ ایسی کسی

بات کا اُن کی کتابوں میں ذکر تک نہ ہونا اس کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ اس معارضے میں شامل نہیں تھے۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ آسانی کے ساتھ نکالا جاسکتا ہے کہ غالبؔ کے معترض ''امان علی خاں'' یا جو کوئی بھی اُن کا نام تھا، غالبؔ لکھنوی نہیں تھے، بلکہ اُن کے سوا کوئی اور شخص تھے۔

ڈاکٹر حنیف نقوی نے بھی حمید احمد خاں اور وفا راشدی کے بیانات کا تجزیہ کر کے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالبؔ لکھنوی اگر معترضینِ غالبؔ میں شامل ہوتے تو کم سے کم نساخؔ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ اُنھوں نے وفا راشدی کے بیانات کی سطحیت بھی واضح کی ہے۴۲۔

شاعری:

نساخؔ نے غالبؔ لکھنوی کے فارسی میں شاعری کرنے اور شاگردِ قتیلؔ ہونے کا لکھا ہے۔ حسبِ معمول رازؔ بلخی اور احمد اللہ ندوی نے بھی نساخؔ کی تقلید میں یہی لکھا ہے۴۴۔ یہ اطلاع بھی معاصرین میں سے صرف نساخؔ نے مہیا کی ہے۔ خود غالبؔ لکھنوی اور ارمانؔ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ کسی اور ذریعے سے بھی اس خبر کی تصدیق نہیں ہوتی۔ مشکل یہ ہے کہ نساخؔ نے اپنا ماخذ بھی تحریر نہیں کیا اور نہ نمونۂ کلام میں غالبؔ لکھنوی کا کوئی فارسی شعر ہی درج کیا ہے، مزید یہ کہ وہ غالبؔ لکھنوی کی اردو شاعری کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے، نہ اُن کے استاد، نہ شاعری کے معیار کے بارے میں اور دیگر متعلقات کی تفصیل بھی مہیا نہیں کرتے۔

قتیلؔ کا انتقال ۲۳ ربیع الثانی ۱۲۳۳ھ مطابق ۲ مارچ ۱۸۱۷ء کو ہوا۴۵، جب کہ نساخ نے غالبؔ لکھنوی کا ترجمہ اپنے تذکرے میں ۱۸۶۰ء کے آس پاس درج کیا (تفصیل آگے آتی ہے)۔ تب تک قتیلؔ کو وفات پائے چالیس سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اتنی طویل مدت قبل غالبؔ لکھنوی کا قتیلؔ کی شاگردی اختیار کرنا قرینِ قیاس ہے بھی، اور نہیں بھی۔

نثار احمد فاروقی نے قتیلؔ کی تصانیف و تالیفات کی فہرست دیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ قتیل نے ''نہر الفصاحت'' (مطبوعہ کان پور، ۱۲۷۰ھ) اور ''شجرۃ الامانی'' نامی دو رسالے میر امان علی کی فرمائش پر اُن کے لڑکے میر محمد حسین کے لیے تحریر کیے۴۶۔ ممکن ہے نساخؔ کی نظر سے یہ دونوں رسالے یا ان میں سے کوئی ایک گزرا ہو اور اس میں ''میر امان علی'' کا نام پڑھ کر اُنھیں ''مرزا امان علی خاں'' کا التباس ہوا ہو اور اسی وجہ سے اُنھوں نے ''مرزا امان علی خاں غالبؔ لکھنوی'' کو شاگردِ قتیلؔ لکھ دیا۔ اوّل تو نثار احمد فاروقی نے متعلقہ شخص کا نام 'میر امان علی' لکھا ہے جو بہر حال ''مرزا امان علی خاں'' سے الگ ہے۔ ''میر'' اور ''مرزا'' کے اختلاف کے علاوہ ''خان'' کا لاحقہ بھی دونوں کو الگ

الگ افراد ثابت کرتا ہے۔ دوسرے: نثار احمد فاروقی نے میر امان علی کے بیٹے کا نام میر محمد حسین لکھا ہے، جب کہ ''داستانِ عشاق'' کے دیباچے میں غالبؔ لکھنوی نے اپنے بیٹے کا نام ''مرزا نوروز علی خاں یکتا'' لکھا ہے ۴۷۔ اُنھوں نے اپنے کسی اور بیٹے کا ذکر نہیں کیا۔ اگر بہ فرضِ محال یہ مان لیا جائے کہ ''میر محمد حسین'' بڑا بیٹا ہوگا اور ''مرزا نوروز علی خاں یکتا'' چھوٹا، تب بھی دونوں کے ناموں میں وہی ''میر'' و ''مرزا'' اور ''خان'' کا اختلاف پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔

ان شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ قتیلؔ سے مرزا امان علی خاں کا نہیں، بل کہ میر امان علی کا تعلق تھا اور غالبؔ لکھنوی، فارسی شاعری میں قتیلؔ کے شاگرد نہیں تھے۔

قتیلؔ فارسی کے ایک مسلّم الثبوت اُستاد شاعر تھے، اس لیے ظاہر ہے اُن کا شاگرد فارسی شاعری ہی میں ہوا جا سکتا تھا، چناں چہ جب نساخؔ نے غالبؔ لکھنوی کو قتیلؔ کا شاگرد لکھ دیا تو یہ بھی لازم آیا کہ وہ فارسی میں شاعری بھی کرتے ہوں گے، یوں نساخؔ کے اس بیان کی عمارت بنی۔ اب جب یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ غالبؔ لکھنوی، قتیلؔ کے شاگرد نہیں تھے تو اُن کی فارسی شاعری بھی مشکوک ٹھہرتی ہے ویسے بھی غالبؔ لکھنوی کی فارسی شاعری کا کوئی نمونہ نہیں ملتا۔ اس سے بھی غالبؔ لکھنوی کے فارسی شاعر ہونے کی تردید ہوتی ہے۔

ارمانؔ اور نساخؔ نے اپنے تذکروں میں غالبؔ لکھنوی کے بالترتیب دو اور چار شعر نمونۂ کلام کے طور پر درج کیے ہیں ۴۸۔ اس کے علاوہ ''قصۂ امیر حمزہ'' میں غالبؔ لکھنوی نے اپنی ایک اردو غزل، کچھ متفرق اردو اشعار اور مثنویات کے کچھ اردو اشعار بھی موقع بہ موقع درج کیے ہیں۔ ان سب سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی اردو میں شاعری کرتے تھے۔

اردو شاعری میں وہ کس کے شاگرد تھے؟ تذکرے اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ خود غالبؔ نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی باقاعدہ شاعر نہیں تھے اور نہ کسی کے شاگرد۔ شعر کہنے کی صلاحیت اُن میں قدرتی ہوگی اور موزونی طبع کے باعث کبھی کبھی وہ شاعری کر لیتے ہوں گے، اسی لیے اُن کا اردو کلام بہت کم ملتا ہے، اتنا کم کہ تذکروں میں اُن کے چار شعروں کا انتخاب ہی بہ تکرار ملتا ہے اور ''قصۂ امیر حمزہ'' کے تقریباً پانچ صد صفحات میں انھوں نے اپنی ایک مکمل غزل، تین متفرق اشعار اور آٹھ جگہ مثنوی کے کچھ اشعار پر مشتمل اردو کلام ہی درج کیا ہے۔ کسی تذکرہ نگار نے اُن کے صاحبِ دیوان ہونے کا ذکر بھی نہیں کیا۔

اس بحث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی اردو شاعری میں نہ تو کسی کے شاگرد

تھے اور نہ اُنھوں نے بہت زیادہ شاعری کی۔ اُن کا جتنا اردو کلام مختلف مآخذ سے مل سکا، اس مضمون کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔

داستانیں:

غالب لکھنوی نے تین داستانیں تصنیف و تالیف کیں، بلکہ زیادہ بہتر طور پر یہ کہنا چاہیے کہ اُن کی تصنیف اور تالیف کردہ تین داستانوں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ **''قصۂ امیر حمزہ''**: معلوم حد تک یہ غالب لکھنوی کی پہلی تالیف ہے۔ یہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں طبع ہو کر شایع ہوگئی تھی، اس لیے نسبتاً سہل الحصول ہے۔ مطبوعہ نسخے کے سرِ ورق پر تحریر ہے: ''ترجمہ کیا ہوا نواب مرزا امان علی خاں بہادر.... '' جب کہ دیباچۂ مولّف میں تحریر ہے کہ: ''میر عزت علی مصر ہیں کہ داستانِ.... حمزہ.... زبانِ فارسی سے زبانِ اردوے معلّٰی میں ترجمہ کر کے چھپوائی جائے''۔ اس سے علم ہوتا ہے کہ غالب لکھنوی نے ''قصۂ امیر حمزہ'' فارسی سے اردو میں منتقل کیا۔

مولّف نے اپنے دیباچے میں واضح کیا ہے کہ انھوں نے یہ قصہ حکیم شیخ امداد علی خلف الرشید حکیم شیخ دلاور علی لکھنوی شاگرد (غالباً فنِ طبابت میں) حکیم میرزا حیدر کی فرمائش پر ترجمہ کیا، اور اُنھیں اس کی تحریک میر عزت علی نے دلائی۔ حکیم صاحب نے عذر پیش کیا کہ مجھے مطب کے باعث فرصت نہیں، اس لیے غالب لکھنوی اس کا ترجمہ کر دیں تو اچھا ہے، چناں چہ اُنھوں نے ''بہ لحاظ اُن کی شفقت و مہربانی کے کہ قدیم سے مترجم کے حال پر مبذول و مرعی ہے، عذر کرنا مناسب نہ جانا، دل و جان سے قبول کیا''۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکیم شیخ امداد علی کے ساتھ غالب لکھنوی کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ غالب لکھنوی نے حکیم امداد علی کے باپ حکیم شیخ دلاور علی کو ''لکھنوی'' لکھا ہے۔ ممکن ہے غالب لکھنوی کے اُن سے دوستانہ مراسم لکھنؤ ہی سے ہوں اور وہ بھی غالب لکھنوی کی طرح لکھنؤ سے کلکتے میں منتقل ہوئے ہوں۔

''قصۂ امیر حمزہ'' کے زمانۂ تصنیف پر بحث کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قصّے کے مطبوعہ نسخے کی تفصیلات درج کر دی جائیں، کیوں کہ آئندہ کے مباحث میں ان کا بار بار حوالہ آئے گا۔

''قصۂ امیر حمزہ'' مترجمۂ غالب لکھنوی کا مطبوعہ نسخہ ۱۲x۷ انچ سائز پر شائع ہوا ہے۔ اس کے پیش ورق (ٹائٹل) پر ذیل کی عبارت لکھی ہے:

''قصۂ امیر حمزہ ___ واضح ہو ___ کہ یہ قصہ حسب المراد قانون ___ بستم ۱۸۴۷ء داخل بہی رجسٹری گورنمنٹ ___ ہوا بموجب قانون مجاریہ سوپریم کونسل کے کوئی صاحب۔ اپنے مطبع میں قصد طبع کا اس کتاب کے نفرماویں۔ ورنہ حسب آئین عند الحاکم ماخوذ ہوں گے اور کتب مطبوع۔ سرکار میں ضبط ہوگی اور تاوان اس کتاب کا اُن کی۔ ذات سے متعلق ہوگا، تاریخ پنجم ماہ جمادی الثانی۔ موافق بیست وسوم ماہ فیروری ۱۸۵۵ء عیسوی۔ مطابق دوازدہم ماہ پھاگن ۱۲۶۱ھ بنگلہ۔ فقط''۔

اس کے بعد تین صفحات میں فہرستِ کتاب ہے۔ اگلا صفحہ کتاب کا سرِ ورق ہے جس کی عبارت درج ذیل ہے:

''ہست کلید درِ گنجِ حکیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمہ داستاں صاحب قراں گیتی ستاں پیغمبرِ آخر الزماں امیر حمزہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد المناف کا۔ ترجمہ کیا ہوا نواب مرزا امان علی خاں بہادر لکھنوی ادام اللہ افضالہ غالبؔ تخلص کا، حسبِ فرمائش جلیل القدر حکیم حاذق، مسیح الزماں شیخ امداد علی صاحب ابن حکیم شیخ دلاور علی صاحب مغفور و مبرور انار اللہ برہانہ لکھنوی۔ مطبع حکیم صاحب محتشم الیہ واقع دار السلطنت کلکتہ میں مترجم موصوف کی تصحیح سے چھاپا۔ ۱۲۷۱ھ ہجری.....''۴۹۔

کتاب کا پیش ورق، فہرست اور سرِ ورق، کل پانچ صفحات پر نمبر شمار نہیں لگائے گئے۔ سرِ ورق کے بعد کتاب کا متن صفحہ ایک سے شروع ہوتا ہے۔

صفحہ ایک کے شروع کا ایک تہائی حصہ مزین ہے جس کے بیچوں بیچ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' درج ہے۔ اس کے بعد متن کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ ہر صفحے پر متن کے گرد چاروں جانب موٹا اور باریک حاشیہ لگایا گیا ہے۔ متن کے حوض کی تقطیع ۲۶ x ۱۳ تا ۱۴ س م ہے، فی صفحہ ۲۱ سطور کتابت ہوئی ہیں، صفحات نمبر حوض کے اوپر درمیان میں لگائے گئے ہیں۔

آغازِ متن میں صفحہ ۱ تا ۳ پر دیباچۂ مؤلف ہے۔ صفحہ ۳ کے بالائی حصّے سے دیباچے کے اختتام کے فوراً بعد ''آغازِ داستان'' کے عنوان سے داستان شروع ہو جاتی ہے۔ ''قصۂ امیر حمزہ'' چار دفاتر پر مشتمل ہے: دفترِ اوّل صفحہ ۳ سے صفحہ ۱۶۵ تک ہے، اسی طرح دفترِ دُوم صفحہ ۱۶۶ تا صفحہ ۳۰۳، دفترِ سوم صفحہ ۳۰۴ تا صفحہ ۳۷۷ اور دفترِ چہارم صفحہ ۳۷۸ تا صفحہ ۴۹۳ پر مشتمل ہے۔ صفحہ ۴۹۳ متنِ کتاب کا آخری صفحہ ہے۔ متن کے اختتام پر اس صفحے کے آخری حصّے میں خاتمۃ الطبع کی درج ذیل عبارت

موجود ہے:

''شکر صد شکر کہ اس قصۂ دل چسپ نے ۱۹؍تاریخ ماہ جمادی الاوّل ۱۲۷۱ھ ہجری مطابق ۷؍ماہ فیروری ۱۸۵۵ء کو دارالامارہ کلکتہ، محلّہ مرزا پور، متصل تھانہ قدیم، مکان نمبر ۱۰، مطبع امدادیہ میں حکیم شیخ امداد علی صاحب کے اہتمام سے منشی سیّد حیدر علی کے، حلیہ طبع پہنا''۔

اگلے دو صفحات، یعنی صفحہ ۴۹۴، ۴۹۵ میں اغلاط نامہ ہے اور اسی پر کتاب کا اختتام ہوتا ہے۔

ان تفصیلات سے علم ہوتا ہے کہ ''قصۂ امیر حمزہ'' کی طباعت ۱۹؍جمادی الاوّل ۱۲۷۱ھ مطابق ۷؍فروری ۱۸۵۵ء کو مکمل ہوئی، جب کہ اس کے بعد اس کا پیش ورق ۵ جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ مطابق ۲۳؍فروری ۱۸۵۵ء کو طبع ہوا۔ یہی یا اس سے کچھ روز بعد کی تاریخ ''قصۂ امیر حمزہ'' کی تاریخِ اشاعت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا متن، سرِ ورق اور اغلاط الگ سے اور اکٹھے، جب کہ کتاب کا پیش ورق اور فہرست بھی اکٹھے اور علاحدہ سے شایع ہوئے ہیں۔ پیش ورق اور فہرست کے صفحات پر نمبر شمار نہ ہونے اور پیش ورق کی پشت سے ہی فہرست کا آغاز ہو جانے سے واضح ہوتا ہے کہ پیش ورق اور فہرست اکٹھے ہی طبع ہوئے ہیں۔ اسی طرح سرِ ورق کی پشت سے کتاب کا متن شروع ہو جاتا ہے، اس وجہ سے سرِ ورق باقی کتاب کے ساتھ طبع ہونے کا یقین کیا جا سکتا ہے۔

خاتمۃ الطبع کے مطابق کتاب کا متن ۱۹؍جمادی الاوّل ۱۲۷۱ھ مطابق ۷؍فروری ۱۸۵۵ء کو طبع ہوا۔ شروع کے چار صفحات (پیش ورق اور فہرست) نکال کر باقی ۴۹۶ صفحات بنتے ہیں (سرِ ورق اور ۴۹۵ صفحات)۔ ان صفحات کی طباعت میں کم و بیش چھے ماہ کا عرصہ ضرور صرف ہوا ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''قصۂ امیر حمزہ'' کی طباعت ۱۸۵۴ء کے وسط میں شروع ہو گئی ہوگی، گویا اس سے قبل غالبؔ لکھنوی نے ''قصۂ امیر حمزہ'' مکمل کر لیا تھا۔ دوسری طرف غالبؔ لکھنوی نے ''داستانِ عشّاق'' کے دیباچے میں ''داستانِ امیر حمزہ'' اور ''خاور نامہ'' کے ترجمے کا ذکر کیا ہے جو مکمل ہو چکے تھے، یعنی ''داستانِ عشّاق'' کی تصنیف ۲۰؍رجب ۱۲۷۱ھ (مطابق ۸؍اپریل ۱۸۵۴ء) سے پہلے ''قصۂ امیر حمزہ'' اور ''ترجمۂ خاور نامہ'' مکمل ہو چکے تھے۔ اندازہ ہے کہ غالبؔ لکھنوی نے ''قصۂ امیر حمزہ'' پہلے اور ''ترجمۂ خاور نامہ'' بعد میں تالیف کی (تفصیل آگے آتی ہے)، یوں ''قصۂ امیر حمزہ'' کی تالیف ۱۸۵۳ء یا اس سے قبل قیاس کی جا سکتی ہے۔

''قصۂ امیر حمزہ'' کے دیباچے میں غالبؔ لکھنوی نے وضاحت کی ہے کہ ''اس داستان میں چار چیزیں ہیں: رزم، بزم، طلسم، عیاری۔ اس واسطے مترجم نے فارسی کی چودہ جلدوں کا ترجمہ

کر کے چار جلدیں کیں''۔ آگے چل کر وہ ''داستانِ امیر حمزہ'' کو سلطان محمود (غزنوی) کے دور کی تخلیق بتاتے ہیں۔ اُن کے مطابق اس داستان کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ''اس کے سننے سے ہر طرح کی خلقت کا طریق معلوم ہوتا ہے اور منصوبہ لڑائی اور قلعہ ستانی و ملک گیری کا خیال میں آتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ بادشاہ کو سناتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب''۔ غالبؔ لکھنوی کے ان دونوں بیانات سے ذیل کے نقاط واضح ہوتے ہیں:

۱۔ عناصرِ داستان ۲۔ فارسی ''داستانِ امیر حمزہ'' کی چودہ جلدوں کی موجودگی۔
۳۔ ''داستانِ امیر حمزہ'' کا سلطان محمود کے زمانے میں تخلیق اور
۴۔ ''داستانِ امیر حمزہ'' کی تخلیق کا مقصد۔

ان میں آخری تین باتیں اس سے پہلے خلیل علی خاں اشکؔ اپنے مولفہ نسخے کے مختصر دیباچے میں لکھ چکے تھے، البتہ عناصرِ داستان کی بات نئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ''داستان'' بطورِ صنف جن خصوصیات کی حامل ہونی چاہیے، اُن میں رزم، بزم، طلسم اور عیاری شامل ہیں۔ طوالت کو اس کی پانچویں مگر اضافی خصوصیت سمجھا جانا چاہیے۔

مندرجہ بالا چار باتوں میں سے جو تین باتیں غالبؔ لکھنوی سے پہلے اشکؔ لکھ چکے ہیں، اُن کی تفصیل اشکؔ کے الفاظ میں دیکھیے۔ اشکؔ اپنے مختصر دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصہ دل چسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے اور اُس زمانہ میں جہاں تک راویانِ شیریں کلام تھے، اُنھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے، امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک ایک داستان حضور میں سناتے تھے''۔[۵۰]

غالبؔ لکھنوی نے اپنا ''قصۂ امیر حمزہ'' ۱۸۵۳ء یا اس سے قبل تالیف کیا۔ اس سے نصف صدی قبل اشکؔ کا مؤلفہ ''قصۂ امیر حمزہ'' شایع ہو چکا تھا[۵۱]، لیکن غالبؔ لکھنوی نے نسخہ اشکؔ کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اُنھیں نسخۂ اشکؔ یا اشکؔ کے قصے کا علم ہی نہ ہو اور یہ بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے جانتے بوجھتے ہوئے اشکؔ کے قصے کا ذکر نہیں کیا تا کہ اُن کی اوّلیت قائم ہو سکے۔ اس سلسلے میں اگر یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ غالبؔ لکھنوی نے اپنے دیباچے میں جن چار نقاط کو واضح کیا ہے، اُن میں تین کا ذکر اشکؔ پہلے ہی کر چکے تھے تو بظاہر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ

لکھنوی، اشکؔ کے قصّے سے واقف تھے اور اُنھوں نے جان بوجھ کر اس کا ذکر نہیں کیا۔

اس سلسلے میں کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے کے لیے ذیل کے شواہد بھی پیشِ نظر رہنے چاہئیں:

۱۔ غالبؔ لکھنوی نے اپنے قصّے میں کسی جگہ نہ تو کوئی ڈینگ مارنے کی کوشش کی ہے اور نہ اشکؔ پر کسی قسم کے چھینٹے اُڑانے کی کوشش کی ہے۔

۲۔ ''قصّۂ امیر حمزہ'' کی تالیف کے لیے غالبؔ لکھنوی سے حکیم شیخ امداد علی نے فرمائش کی اور اُنھیں اس کی تحریک میر عزت علی نے دی۔ اگر یہ دونوں حضرات اشکؔ کے قصّے سے واقف ہوتے تو اس کا ذکر ضرور کرتے اور اگر اوّلیت حاصل کرنے کا ہی مسئلہ ہوتا، تب بھی اشکؔ کے قصّے کو نظر انداز کرنے کا کوئی قرینہ اور اوّلیت کا کوئی نہ کوئی دعوا اُن کی طرف سے ضرور پیش ہوتا، لیکن ان میں سے کوئی بات غالبؔ لکھنوی کے قصّے میں نظر نہیں آتی، جس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ دونوں حضرات بھی اشکؔ کے قصّے سے واقف نہیں تھے۔

۳۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سہیل بخاری کی تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ اشکؔ اور غالبؔ لکھنوی کے قصّوں میں بعض مطالب مشترک ضرور ہیں لیکن یہ اس لیے ہے کہ دونوں قصّوں کا ماخذ ایک ہی فارسی نسخہ ہے۔ اشتراکات کے علاوہ دونوں قصّوں میں کئی مقامات پر تفاوت بھی ہے جس کے پیشِ نظر یہ طے ہو جاتا ہے کہ دونوں قصّے الگ الگ ہیں اور غالبؔ لکھنوی نے اشکؔ کے چراغ سے چراغ نہیں جلایا۵۲۔

مندرجہ بالا شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''قصّۂ امیر حمزہ'' کا نسخۂ غالبؔ لکھنوی اور نسخۂ اشکؔ ایک دوسرے سے مختلف نسخے ہیں اور غالبؔ لکھنوی نے اشکؔ کے قصّے کو ماخذ نہیں بنایا۔ دونوں کا ماخذی فارسی نسخہ ایک ہی ہے، اس لیے دونوں میں بعض اُمور مشترک ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے غالبؔ لکھنوی کے ''قصّۂ امیر حمزہ'' کی تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا:

> ''کتاب کی عبارت رواں، آسان اور شگفتہ و دل چسپ ہے۔ امان علی خاں نے قافیہ و مسجع سے پرہیز کیا ہے اور یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔ ممکن ہے یہ کلکتے کا اثر ہو یا پھر اشکؔ کے ترجمے ہی کی تقلید ہو''۔۵۳

اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے تحقیق کے بعد یہ نتائج اخذ کیے کہ غالبؔ لکھنوی نے اشکؔ کی پیروی نہیں کی لیکن یہاں اُنھیں اپنے نتائج کا خیال نہیں رہا اور وہ رواروی

میں غالبؔ لکھنوی کی تقلیدِ اشکؔ کی بات کہہ گئے۔ دوسرے اُنھوں نے غالبؔ کے لکھنوی ہونے کے باعث اُن کی زبان و بیان میں روانی اور آسانی پر جو حیرت کا اظہار کیا ہے، اس سے لگتا ہے کہ اُنھوں نے غالبؔ لکھنوی کا دیباچہ غور سے نہیں پڑھا۔ غالبؔ لکھنوی نے صاف لکھ دیا ہے کہ اس تالیف کے ایک فرمائشی میر عزت اللہ ''داستانِ امیر حمزہ'' کو ''زبانِ اُردوے معلّٰی میں ترجمہ کر کے'' چھپوانے کے خواہش مند تھے اور دوسرے فرمائشی حکیم شیخ امداد علی کی ہدایت تھی کہ ترجمۂ داستان ''صاف صاف روزمرہ اردو کا لکھا جائے کہ خاص و عام کو پسند آئے''، چناں چہ غالبؔ لکھنوی نے فرمائش پر آسان زبان اور رواں بیان ممکن بنانے کا التزام کیا۔

اس کے باوجود ''قصۂ امیر حمزہ'' میں روزمرہ، محاورہ، الفاظ کی تذکیر و تانیث وغیرہ، اس کے علاوہ بیان میں لکھنوی رنگ کی کچھ مثالیں ڈاکٹر سہیل بخاری نے نقل کی ہیں ۵۴۔ ان مظاہر سے ''قصۂ امیر حمزہ'' کی زبان و بیان سے مولّف کی لکھنویت صاف طور پر ٹپکتی ہے۔ بعض مقامات پر قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ مولّف نے بہ امرِ مجبوری اپنے اشہبِ قلم کو لگام دے رکھی ہے اور اگر اُنھیں ڈھیل مل جائے تو اُن کے خامے کی جولانیاں پکار پکار کر کہہ اُٹھیں کہ ہم ایک لکھنوی قلم کار کے فن کا شہ کار ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند نے واضح کیا کہ اُنھیں غالبؔ لکھنوی کے ''قصۂ امیر حمزہ'' کا کوئی نسخہ دست یاب نہیں ہو سکا، چناں چہ اُنھوں نے ڈاکٹر سہیل بخاری کے تحقیقی مقالے سے اس کا اقتباس درج کیا ہے۔ اس کے باوجود اُنھوں نے صرف ایک اقتباس کی بنیاد پر غالبؔ لکھنوی کے بارے میں یہ حکم لگا دیا کہ: ''لکھنوی ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے عبارت آرائی اور مرصّع بیانی کو اپنا شیوہ بنایا'' ۵۵۔ اس سلسلے میں جو تفصیل پہلے گزری ہے، اُسے مکرر ملاحظہ کیجیے تو واضح ہو گا کہ غالبؔ لکھنوی پر ''مرصّع نگاری'' اور ''عبارت آرائی'' کو ''شیوہ'' بنانے کے الزام میں کوئی حقیقت نہیں۔ عبارت آرائی کے کچھ نہ کچھ ہلکے نمونے اور مرصّع نگاری کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تو ممکن ہے تلاش کے بعد ''قصۂ امیر حمزہ'' سے مل جائیں لیکن انھیں غالبؔ لکھنوی کا ''شیوہ'' قرار دینا نہ صرف زیادتی ہے، بل کہ غالبؔ لکھنوی پر سراسر اتہام ہے۔

غالبؔ لکھنوی کا ''قصۂ امیر حمزہ'' اگرچہ شائع ہو کر عام ہو گیا تھا لیکن فی زمانہ اس کے یہ مطبوعہ نسخے از حد کم یاب ہیں۔ اس کے کسی قلمی نسخے کا تو کہیں سراغ نہیں ملتا اور مطبوعہ کے بھی صرف دو نسخوں کی موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک نسخہ کتب خانۂ جامعہ پنجاب (پنجاب یونی ورسٹی

لائبریری) لاہور میں ہے۵۶، اور دوسرا نسخہ امریکی مستشرقہ فرانسس پریچٹ نے دہلی سے خریدا اور اپنے ساتھ امریکا لے گئیں۵۷۔ اسی نسخے کی بنیاد پر آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی یہ داستان شائع کر رہی ہے۔

ایک عرصے تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ ''داستانِ امیر حمزہ'' کا جو یک جلدی نسخہ نول کشور پریس سے عبداللہ بلگرامی کے نام سے شایع ہوا، وہ اُنھوں نے خلیل علی خاں اشکؔ کے نسخے پر نظرِ ثانی کر کے تیار کیا تھا اور بعد میں سیّد تصدّق حسین رضوی نے یہی عمل عبداللہ بلگرامی کے نسخے کے ساتھ دُہرا کر اپنا نسخہ تیار کیا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے غالبؔ لکھنوی اور تصدّق رضوی کے نسخوں کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مطبع منشی نول کشور کے اعلان کے برعکس تصدّق رضوی نے عبداللہ بلگرامی نہیں، بل کہ غالبؔ لکھنوی کے نسخے میں ترمیم کر کے اپنا نسخہ تشکیل دیا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے دونوں نسخوں کی بعض عبارتوں کا تقابلی مطالعہ کر کے اپنے دعوے کے حق میں متعدد ثبوت پیش کیے ہیں۵۸۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے ڈاکٹر سہیل بخاری کے ان بیانات کا حوالہ دیا ہے لیکن اُن کا کہنا ہے کہ تصدّق رضوی کے بجائے عبداللہ بلگرامی نے غالبؔ لکھنوی کے نسخے میں ترمیم و اصلاح کے ذریعے اپنا نسخہ تشکیل دیا اور عبداللہ بلگرامی کے نسخے میں ترمیم کا عمل دُہرا کر تصدّق رضوی نے اپنا نسخہ ترتیب دیا۵۹۔ اُن کی تقلید میں ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے بھی یہی لکھا ہے۶۰۔ اور صحیح صورتِ حال بھی یہی ہے۔ لگتا ہے ڈاکٹر سہیل بخاری کو عبداللہ بلگرامی کا نسخہ دست یاب نہیں ہو سکا، اس لیے وہ نسخۂ غالبؔ کا موازنہ نسخۂ عبداللہ سے نہیں کر سکے، ورنہ اُن کا موقف بھی یہی ہوتا۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے نائب حسین نقوی کے حوالے سے غالبؔ لکھنوی کے ''قصّۂ امیر حمزہ'' کی دہلی سے ۱۸۶۸ء کی اشاعت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اُنھوں نے یہ داستان مرتب کی تھی۶۱۔ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے یہی بات بغیر کسی حوالے کے اپنے ہاں نقل کر دی ہے۶۲۔ نائب حسین نقوی کی اطلاع درست نہیں۔ وہ ۱۸۶۸ء میں ''داستانِ امیر حمزہ'' کی جس اُردو اشاعت کا ذکر کر رہے ہیں، وہ غالبؔ لکھنوی کا نہیں، بل کہ اشکؔ کے قصّے کا نسخہ ہے۔ نائب حسین نقوی نے اسی اشاعت کو بنیاد بنا کر اشکؔ کا قصّہ مرتّب کیا ہے جس کا مسودہ مجلسِ ترقی ادب، لاہور میں اشاعت کے لیے موجود ہے۔ غالبؔ لکھنوی کے قصّے کی کسی دوسری اشاعت کی مصدّقہ اطلاع موجود نہیں۔

۲۔ ترجمۂ خاور نامہ:

غالبؔ لکھنوی کی یہ تالیف فی الوقت نایاب ہے۔ اس تالیف کا علم ''داستانِ عشّاق'' کے

دیباچے سے ہوتا ہے۔ اس میں غالبؔ لکھنوی لکھتے ہیں:

''واضح ہو کہ ایک دن یہ خاک سار ہم صحبتِ احباب تھا۔ شعر و سخن کے تذکرے میں شدہ شدہ چرچا داستان سرائی کا ہوا۔ سیّد عالی حسب و والانسب میر عزت علی صاحب نے فرمایا کہ ہر چند تُو نے ترجمہ خاور نامہ کا حسبِ استدعاے فرزندِ ارجمند خود مرزا نوروز علی خاں یکتاؔ لکھا ہے''۔ ۶۳

اس ترجمے کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ مذکورہ بالا عبارت غالبؔ لکھنوی کے دیباچے کا حصّہ ہے۔ اسی کے ساتھ اُنھوں نے ''قصّۂ امیر حمزہ'' کی تالیف اور ''داستانِ عشّاق'' کا سببِ تالیف بھی بیان کیا ہے۔ ترتیب کے اعتبار سے ''ترجمۂ خاور نامہ'' کا ذکر پہلے اور ''داستانِ امیر حمزہ'' کے ترجمے کا ذکر بعد میں ہوا ہے، اس کا مطلب ہوا کہ ''ترجمۂ خاور نامہ'' پہلے اور ''قصّۂ امیر حمزہ'' بعد میں تالیف ہوا، لیکن اس صورت میں غالبؔ لکھنوی ''قصّۂ امیر حمزہ'' کے دیباچے میں ''ترجمۂ خاور نامہ'' کا ذکر ضرور کرتے جیسا کہ انھوں نے ''داستانِ عشاق'' کے دیباچے میں اپنی پہلی تالیفات کا ذکر کیا ہے۔ ایسا نہ ہونے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ''قصّۂ امیر حمزہ'' پہلے اور ''ترجمۂ خاور نامہ'' بعد میں تالیف ہوئی، یعنی ''ترجمۂ خاور نامہ'' کی تالیف ''داستانِ عشّاق'' کی تالیف (۲۰ر رجب ۱۲۷۱ھ مطابق ۸ر اپریل ۱۸۵۴ء) سے کم و بیش چھ ماہ قبل ہوگئی ہوگی۔

۳۔ داستانِ عشّاق:

غالبؔ لکھنوی کی یہ تصنیف نایاب تھی۔ اس کی بازیافت کا سہرا قاضی عبدالودود کے سر ہے۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے اپنے ادارے ''ادارۂ تحقیقاتِ اردو'' پٹنہ میں ایک نمائشِ مخطوطات کا اہتمام کیا۔ اسی سلسلے میں ''داستانِ عشّاق'' کا قلمی نسخہ بھی نمائش کے لیے آیا۔ قاضی صاحب نے اس کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے اس پر ایک تفصیلی تعارفی مضمون لکھ کر شایع کرایا اور اس داستان کے کچھ اقتباسات بھی اپنے مضمون میں نقل کیے۔ ۶۴

قاضی صاحب کے مذکورہ بالا مضمون سے ''داستانِ عشّاق'' سے متعلق جو معلومات دستیاب ہوتی ہیں، اُن کے مطابق اس داستان کا جو قلمی نسخہ نمائش کے لیے مستعار آیا تھا، وہ مدرسۂ سلیمانیہ، گذری، شہر پٹنہ، نمبر ۸ کا مملوکہ تھا۔ یہ نسخہ شجاعت علی نے ۱۴ر شوال ۱۲۷۹ھ روز سہ شنبہ کو نواب سیّد محمد باقر خان کے لیے تیار کر کے مکمل کیا۔ اس کی ضخامت ''۲۷ جز ۶۵ بقولِ کاتب'' تھی، جب کہ قاضی محمد سعید نے اس کی ضخامت ''بقولِ کاتب ۲۸ جزو، سطر ۲۰ سطری'' اور تاریخِ کتابت

''۱۴رشعبان ۱۲۷۹ھ'' تحریر کی ہے۶۶۔ قاضی عبدالودود نے ''داستانِ عشاق'' کو بغور دیکھا ہے اور اس پر تفصیلی مضمون قلم بند کیا ہے۔ اس لیے امکان ہے کہ اُنھوں نے درست معلومات مہیا کی ہوں گی، جب کہ قاضی محمد سعید نے سیکڑوں مخطوطات کی فہرست تیار کی، لہٰذا ''داستانِ عشاق'' کا مخطوطہ بھی دیگر مخطوطات کی طرح اُنھوں نے سرسری طور پر دیکھا ہوگا، اس لیے اُن کی مہیا کی ہوئی معلومات میں غلطی کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

یہ قلمی نسخہ ''داستانِ عشاق'' کے صرف پہلے حصے پر مشتمل ہے۔ معلوم نہیں غالب لکھنوی نے صرف حصۂ اوّل ہی مکمل کیا، یا دیگر حصے بھی لکھنے کا اُنھیں موقع مل گیا جو ہمارے سامنے موجود نہیں۔ ''داستانِ عشاق'' کے خاتمے میں مصنف نے اس کی تاریخِ تکمیل ۲۰رجب ۱۲۷۱ھ کو بہ مقام کلکتہ لکھی ہے۔ تقویم کی رُو سے ۲۰رجب ۱۲۷۱ھ مطابق ہے ۸راپریل ۱۸۵۴ء کے۔ غالب لکھنوی نے اپنے دیباچے میں سببِ تالیف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُنھوں نے یہ داستان میر عزت علی کی فرمائش پر قلم بند کی۔ یہ وہی میر عزت علی ہیں جنھوں نے حکیم شیخ امداد علی کو تحریک دی اور اُنھوں نے فرمائش کر کے غالب لکھنوی سے ''قصۂ امیر حمزہ'' تالیف کرایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ''قصۂ امیر حمزہ'' کی تالیف کے وقت غالب لکھنوی اور میر عزت علی میں اتنی قربت نہیں تھی کہ وہ حکیم شیخ امداد علی کے بجائے ''قصۂ امیر حمزہ'' کے ترجمے کے لیے غالب لکھنوی کو بہ راہِ راست کہتے، لیکن ''داستانِ عشاق'' کی تصنیف سے کچھ پہلے تک اُن کے مراسم غالب لکھنوی کے ساتھ اتنے گہرے اور استوار ہو چکے تھے کہ اُنھوں نے اس داستان کی تصنیف کے لیے غالب لکھنوی سے بہ راہِ راست فرمائش کی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب لکھنوی کے حکیم شیخ امداد علی اور میر عزت علی سے گہرے دوستانہ مراسم استوار تھے۔

''داستانِ عشاق''، غالب لکھنوی کی طبع زاد تصنیف ہے۔ اُن کی بقیہ دو کتابیں تالیفات کے زمرے میں آتی ہیں۔ اُنھوں نے خود، اور ''قصۂ امیر حمزہ'' کے سرِ ورق پر بھی؛ اُنھیں تراجم لکھا ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ غالب لکھنوی نے ''قصۂ امیر حمزہ'' میں اپنی طرف سے زبان و بیان کے ایسے قابلِ قدر اضافے کیے ہیں کہ وہ صرف ترجمہ نہیں رہی، اُن کی تالیف بن گئی ہے۔ ''خاور نامہ'' کے ترجمے میں بھی یقیناً وہ اپنی طبیعت کی اُپج سے بچ نہیں سکے ہوں گے، لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی پہلی دو کتابیں تراجم نہیں، بلکہ اُن کی تالیفات ہیں۔

''داستانِ عشاق'' کا مذکورہ قلمی نسخہ ۱۹۵۹ء تک موجود تھا۔ اس کے بعد سے آج تک اس

کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ معلوم نہیں گذشتہ نصف صدی کے نشیب و فراز کے بعد یہ آج بھی زندہ سلامت ہے یا گردشِ روزگار کی نذر ہو چکا ہے۔

مزید تصانیف و تالیفات:

''قصّۂ امیر حمزہ''، ''ترجمۂ خاور نامہ'' اور ''داستانِ عشّاق'' کے علاوہ غالبؔ لکھنوی کی کسی اور نثری یا منظوم تصنیف یا تالیف کا سراغ نہیں ملتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ لکھنوی باقاعدہ یا پیشہ ور داستان نویس نہیں تھے۔ اُنھوں نے اپنی تینوں داستانیں فرمائشوں پر تالیف و تصنیف کیں۔ جیسا کہ تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے کہ اُنھوں نے مذکورہ تینوں داستانیں ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء تک تالیف و تصنیف کر لی تھیں۔ اس کے بعد اُن کی کسی اور تحریر کا علم نہیں ہوتا۔ اگر وہ باقاعدہ اور منصوبہ بند داستان نگار ہوتے تو کم و بیش تین سال میں تین ضخیم داستانیں لکھنے کے بعد چُپ نہ بیٹھ جاتے، بلکہ اس طرز کی مزید داستانیں، قصّے یا کچھ اور ضرور لکھتے۔ نسّاخ کے تذکرے ''سخنِ شعرا'' کی تالیف ۱۸۶۴ء تک غالبؔ لکھنوی کی حیات کے شواہد ملتے ہیں، یعنی ''داستانِ عشّاق'' کی تکمیل کے کم و بیش دس سال بعد تک وہ زندہ تھے۔ اگر وہ اپنی تحریروں کا سلسلہ جاری رکھتے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان دس سالوں میں اپنی پہلی داستانوں کی طرز پر کم از کم چار پانچ داستانیں مزید لکھ یا تالیف کر سکتے تھے۔ اندازہ ہے کہ اگر اُنھوں نے کچھ لکھا ہوتا تو ''داستانِ عشّاق'' کی طرح اُس کا پتا بھی چل گیا ہوتا، سب کا نہ سہی کسی ایک دو کے بارے میں ہی معلومات مل جاتیں۔

ضمیمہ الف

''قصّۂ امیر حمزہ'' سے اقتباسات

(دیباچہ مولّف، صفحہ ۱):

سبحان اللہ! کیا صنّاعی ہے، صانعِ بے چوں و چرا کی کہ دنیا سا طلسم بنایا اور اٹھارہ ہزار عالم پیدا کر کے اس طلسم میں بسایا۔ لوح اس طلسم کی اُس کے قبضۂ قدرت میں محفوظ ہے اور ہر اسیرِ طلسم باوجود پابندی محفوظ ہے۔ عجب قدرت و توانائی ہے کہ خاک کو آب پر قائم کیا اور خیمۂ دوازدہ برجی فلک کو بے اعانتِ ستون ۶۷ معلق نصب کر کے کواکبِ سیارہ و ثوابت سے کیا کیا نہ زینت و حسن دیا۔ الحق فلک دوّار، جو دن رات چرخی کی طرح چرخ کھاتا ہے، عالمِ خوشی میں مخلوقات کو اپنا رقص دکھاتا ۶۸ [ہے۔ اللہ] اللہ رے حکومت! کہ آب و آتش و خاک و باد باوجود تضاد ایسے با یک

دگر شیرو[شکر ہیں] کہ عالمِ اتحاد میں فی المثل مشہور تر ہیں۔

لمتر جمہ نظم:

صانع و قادر و توانا ہے	کبریائی اُسے [ہی زیبا] ہے
ہے وہ ایسا حکیم اور دانا	کُن سے کی کائنات ہے پیدا
گُل سے کیا کیا بنائے رنگیں گُل	اُس کی صنّاعی پر ہیں شاہد گُل
شب کو انجم سے اُس نے زینت دی	دن کو خورشید سے ضیا بخشی
مُنھ میں جب تک مرے ۶۹ زباں تر ہے	لب پہ شکرِ خدائے اکبر ہے

نعت:

واہ! کیا خوشی طالعی ہے ہم لوگوں کی کہ ہمارے نبیؐ نے ختم الانبیاء خطاب پایا اور واجب الوجود نے اُس کے وجودِ باجود کو باعثِ بنائے طلسمِ دنیا فرمایا۔ زہے ہادیِ برحق! اس طلسم کے ساکنوں کو کیا کیا روش اور روی ۷۰ تعلیم کیے ۷۱ اور کس کس طرح اسرارِ خفی وجلی تفہیم کیے ۷۲۔

مترجمہ نظم (ص۲):

ہے وہ ختم النبی ہمارا ہی	جس کو کہتے ہیں احمدِ عربی
کیوں نہ ہووے وہ مالکِ دوسرا	جس کو اپنا کہے حبیب، خدا
نورِ خالق سے اُس کی خلقت ہے	فرض ہر اک پہ ۷۳ اُس کی طاعت ہے
ایک ادنیٰ سی اُس کی ہے یہ سخا	نورِ ایماں ہے کفر کو بخشا
ہے تمنا کہ حشر ہو جس دم	سرمرا ۷۴ ہوئے اُس کے زیرِ قدم

صلی اللہ علی و آلہ واصحابہ اجمعین ۔اس داستانِ دل چسپ کے سیر کرنے والوں اور سننے والوں پر یہ واضح ہو کہ حکیم شیخ مدار علی صاحب خلف الرشید حکیم شیخ دلاور علی صاحب مغفور لکھنوی نے، کہ شاگردِ نامی حکیم میرزا حیدر مبرور کے ہیں اور نفس الامر میں فن طبابت میں ید بیضا رکھتے ہیں، اس اضعف العباد ہیچ مدان، کج مج زبان امان علی خاں داماد شاہ زادہ فتح حیدر خلفِ اکبر جنت نشاں ٹیپو سلطان سے فرمایا کہ شفیقِ معظم میر عزت علی صاحب مُصر ہیں کہ داستانِ سلطان غفراں نشاں حلقہ فگن گوش، گردن کشاں، صاحب قراں، گیتی ستاں، عمِ کُبارِ پیغمبرِ آخر الزماں، گیرندہ گرزِ سام و نریماں، شکنندۂ کمانِ رستم دستاں، زُلالِ قاف کو چک سلیماں، یعنی حمزہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف، زبانِ فارسی سے زبانِ اردوے معلّٰی میں ترجمہ کر کے چھپوائی جائے۔ چوں کہ مجھ کو مطب

سے فرصت نہیں ہے، اس سبب سے انجام اس کا دشوار ہے، اور مطب سے ہاتھ اُٹھاتا ہوں تو بندگانِ حکیم علی الاطلاق کے علاج ودرماں سے معذور رہتا ہوں، لہٰذا بہ لحاظِ محبتِ قدیم تجھ کو تکلیف دیتا ہوں لیکن صاف صاف روزمرہ اُردو کا لکھا جائے کہ خاص وعام کو پسند آئے۔ احقر العباد کج مج زباں نے بہ لحاظ اُن کی شفقت ومہربانی کے، کہ قدیم سے مترجم کے حال پر مبذول ومرعی ہے، عذر کرنا مناسب نہ جانا، دل وجان سے قبول کیا اور خامۂ ترجمہ نگار کو ہاتھ میں لیا اور بہ سبب اس کے کہ اس داستان میں چار چیزیں ہیں: رزم، بزم، طلسم، عیاری۔ اس واسطے مترجم نے فارسی کی چودہ جلدوں کا ترجمہ کر کے چار جلدیں کیں۔ اب شایقانِ انصاف دوست کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ اس نامربوط کو مربوط تصوّر کر کے ہنگامِ مطالعہ مترجم کو دعاے خیر سے یاد فرماویں (ص۳) اور واضح ہو کہ بنیاد اس قصۂ دل چسپ کی سلطان محمود کے وقت سے ہے اور داستان سرایانِ شیریں مقال نے وجہِ تصنیف اس قصّہ کی یہ تحریر کی ہے کہ اس کے سُننے سے ہر طرح کی خلقت کا طریق معلوم ہوتا ہے اور منصوبہ لڑائی اور قلعہ ستانی وملک گیری کا خیال دل میں آتا ہے، اس لیے ہمیشہ بادشاہ کو سناتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آغازِ داستان:

روایانِ روایاتِ شیریں اور حاکیانِ حکایاتِ دل نشیں اس افسانہ کو یوں حکایت کرتے ہیں کہ سرزمینِ ایران کے شہر مدائن میں ایک بادشاہ تھا قبّاد کامران نام کا۔ وہ مستمندان ناکام رعیت پروری میں اپنا نظیر اور عدالت گستری میں عدیل نہ رکھتا تھا۔ ملک میں اُس کے محتاج وفقیر مثالِ عنقا بے نشاں اور زبردست وزیردست یک ساں تھے۔ چھوٹا بڑا باہم یک دگر دل جوئی کرتا اور ایک دوسرے پر احسان دھرتا تھا۔ دن رات دروازے گھروں کے مثلِ چشمِ پاسبان کھلے رہتے تھے کہ چور حنا تک کا آسیاے عدالت میں پیسا جاتا تھا۔ چور چوری سے بھی نام چوری کا زبان پر نہ لاتا تھا۔ اگر راہی راہ میں کچھ پڑا پاتا تو ڈھونڈ کر مالک کو دے جاتا۔ شجاع اور زور آور ایسا تھا کہ رستم بہ ایں شجاعت وتوانائی کہ مشہور ہے، اُس کے مقابلہ میں مثلِ پیرزال ناتواں وبزدل گنا جاتا تھا، اور اس بادشاہ کے چالیس وزیر تھے۔ ہر وزیر لقمان وافلاطون کی دانائی پر خطِ نسخ کھینچتا تھا اور سات سے ۵ے حکیم کہ ہر ایک علومِ حکمت وہندسہ ورمل وجفر ونجوم میں جالینوس وارسطو واقلیدس وفیثا غورث کو خطاب کے لائق نہ گنتا تھا اور سات سے ندیم کہ علمِ ادب وعلمِ مجلس میں بہ ہر متنفس اُستادِ اُستادانِ قدیم تھا۔

(ص۴۹۳) = بحقِ شہادتِ دندان مبارک محمد رسول اللہ ﷺ و بہ تصدقِ زخم پائے مبارک ونماز و نیاز علی ابن ابی طالبؓ اس مترجم ومحرر کی عاقبت بخیر اور دنیا میں کسی کا محتاج نہ کر کے اپنے خزانۂ غیب سے حسبِ دل خواہ سرفراز کر اور راست و دروغ اس قصّہ کا راویانِ موجد سے متعلق کر۔ فقط!

(خاتمۃ الطبع): شکر صد شکر کہ اس قصۂ دل چسپ نے ۱۹ تاریخ جمادی الاوّل ۱۲۷۱ھ مطابق ۷/ماہ فبروری ۱۸۵۵ء کو دارالامارہ کلکتہ، محلّہ مرزا پور، متصل تھانہ [تھانا؟] قدیم، مکان نمبر ۱۰، مطبع امدادیہ میں حکیم شیخ امداد علی صاحب کے اہتمام سے منشی سیّد حیدر علی کے حلیۂ طبع پہنا۔

ضمیمہ ب

''داستانِ عشّاق'' کے منتخب حصّے

(۱) پلا مجھ کو ساقی شرابِ سخن — لکھوں نشے میں حمدِ حق بے محن
سراپا خُم تن میں گر جوش ہو — تو تحریر کا، حمد کی، جوش ہو

واہ! کیا صنّاعی ہے صانعِ بے چون و چرا کی کہ کُن کہتے ہی کائنات پیدا ہوگئی۔ زہے ذاتِ ستودہ صفات کہ جس کو واجب الوجود نے خلعتِ لولاک لما خلقت الافلاک پہنایا۔ لمصنّفہ:

محمدؐ کی وہ ذات ہے خوش صفات — جسے حق کہے باعثِ کائنات
پلا مجھ کو ساقی شرابِ طہور — صفت تیری لکھنی ہے مجھ کو ضرور

لمصنّفہ:

کیوں کر نہ نامِ ساقی وردِ زباں رہے — جسے خالق ہم نام اپنا کہے
امامِ دو عالم، وصیِ رسولؐ — بنی عم نبیؐ کا ہے روحِ بتول
علی نام، شیرِ خدا ہے لقب — یداللہ کہتی ہے مخلوق سب

کسی نشے سے (ہے) نہیں مجھ کو شوق
[کہ] ہے اُلفتِ پنج تن سے ہی ذوق ۷۶

(۲) **سببِ تصنیف**:

سیر کرنے والوں پر اس داستان غریب البنیا کے ۷۷ واضح ہو کہ ایک دن یہ خاک سار ہیچ مدان امام علی خاں، غالب تخلص، رہنے والا دارالسلطنت لکھنؤ کا، ہم صحبتِ احباب تھا۔ شعر و سخن کے تذکرہ

میں شدہ شدہ چرچا داستان سرائی کا ہوا، سیّدِ عالی حسب و والانسب میر عزت علی صاحب نے فرمایا کہ ہر چند تُو نے ترجمہ ''خاور نامہ'' کا سببِ استدعاے فرزندِ ارجمند خود، مرزا نوروز علی خاں یکتا اور ترجمہ ''داستانِ امیر حمزہ'' کا بہ مُوجب فرمائش شاگردِ رشید حکیم مرزا حیدر جنت نشاں، حکیم حاذق شیخ امداد علی خلفِ ارشد مرحوم حکیم شیخ دلاور صاحب زبانِ اردو میں لکھا ہے، اگر میری خاطر سے ایک داستان، کہ جس میں رزم و بزم و طلسم و عیاری کا بیان ہو، زبانِ اُردو میں بہ سلاستِ عبارت، معرا از استعارات و لغت تصنیف کرے، قطع نظر اس کے کہ تا قیامِ جہان ناپاے دار تیرا نام صفحۂ روزگار پر قائم رہے گا، بارِ منّت میرے سر پر دھرے، اَور احباب بھی، جو شریکِ جلسہ تھے، معینِ کلامِ سیّد والا تبار باصرار ہوئے۔ مصنّف نے انکار سے اقبال کو بہتر جانا، بسر و چشم کہنے کو ان کے مانا، نام ''داستانِ عشاق'' رکھا۔

(۳) آغازِ دستان:

پلا مجھ کو ساقی شرابِ خیال — لکھوں نشے میں عاشقوں کا میں حال
کروں میں وہ عشقِ مجازی بیاں — کہ عشقِ حقیقی کا دیوے نشاں

روایانِ روایاتِ شیریں اور حاکیانِ حکایاتِ دل نشیں بیان کرتے ہیں کہ ملکِ روم میں ایک بادشاہ رہتا تھا، ملک خصال، شوکت و جلال میں عدیم المثال، مقبولِ انام، ناہید شاہ نام، اگر اسکندرِ رومی سے اُس کو نسبت دوں تو بے سخن منہ کی کھاوں، نوشیرواں اُس کی عدالت کے سامنے نامنصف اور حاتم اُس کی سخاوت کے رُوبرو بخیل، رستم اُس کی قوت و شجاعت کے آگے بُزدل و ناتواں کہلاتا تھا، رُعب سے اُس کے ہر صبح خورشیدِ فلک غارِ مشرق سے کانپتا باہر آتا اور اگر ذرا بھی کسی ذرۂ بے مقدار کو نگاہِ کرم سے دیکھتا تو زندانِ کسوف میں مقیّد کیا جاتا، ہمہ تن با اخلاق، رعیّت پروری میں شہرۂ آفاق، تمام رات دروازے گھروں کے کھلے رہتے، چوکیدار رنجِ شب بیداری نہ سہتے، چور نام کو پیدا نہ تھا، صدائے گدا سے گوش آشنا نہ تھا۔ لمصنّفہ:

رنگ رلیوں میں کٹتی تھی اوقات
روز تھا عید، شب برات تھی رات

مگر باوجود شوکت و اقتدار کے ہمہ تن دل اس کا بہ رنگِ لالہ پُر داغ تھا کہ خانۂ تاریک اُس کا بے روشن چراغ تھا۔ ایک دن اپنے وزیرِ دانش آرا سے کہ اسمِ بامسمّٰی تھا، خلوت میں کہا کہ بہت انتظار کیا، لیکن اب تک کوئی فرزند آفریدگار نے نہ دیا کہ وارثِ تاج و تخت و نگیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ اس مملکت کی حکومت تجھ کو دوں اور خود کسی پہاڑ پر عُزلت اختیار کروں۔

(۴) دایہ جی پیٹ پکڑے دوڑے آئیں اور ہم راز و محرمِ راز سے پوچھنے لگیں کہ اُوہی! یہ نامحرم کون ہیں، اور ان کو تم بے دھڑک بارہ دری میں کیوں لائیں؟ وزیرزادیوں نے کہا کہ ہم کیا جانیں کہ کون ہیں؟ ہمارے لانے کا سبب یہ ہے کہ کوئی اپنے گھر آئے کتے کو بھی نہیں دھتکارتا، یہ تو آدمی ہیں، باقی حال ان کا پوچھنے سے معلوم ہو جائے گا، چھپنے نہ پائے گا۔ دایہ نری حلوہ (کذا) خاتون ہی تھی، لگی بڑبڑانے۔ ہم راز و محرمِ راز نے کہا کہ دایہ جی! ہم لوگوں کے پیچھے چڑیل کی طرح سے نہ پڑو! بھنبھنا و اپنی شہزادی سے جس کو تم نے دودھ پلایا ہے۔ سچ پوچھو، یہ تمھارے دودھ نے اثر دکھلایا ہے۔ خورشید لقا نے دایہ سے کہا کہ تم بے واسطہ وزیرزادیوں سے تکرار کیوں کرتی ہو؟ ۸ے عبث کس لیے لڑتی مرتی ہو، چپکی رہو! جو کہنا ہو، مجھ سے کہو! دایہ بولی بلالوں! میں وزیرزادیوں سے کیوں تکرار کرنے لگی تھی، یہ البتہ پوچھا کہ یہ نامحرم کون ہیں کہ بے دھڑک باغ میں چلے آئے۔ ابھی یہ خبر اگر ملکہ صاحب و بادشاہ کو پہنچتی ہے تو اس بندی کا ناحق سر مونڈا جاتا ہے۔ اُنھیں کون پوچھتا پچھتاتا ہے کہ یہ چھوکریاں سمجھ کر چھوٹ جائیں گی۔ مجھ کو بڑی ملکہ صاحب، بادشاہ سے سزا دلوائیں گی۔ ہم راز و محرمِ راز نے کہا کہ اگر حضور دایہ جی کی تقریر کوئی سنے تو وہ جانے کہ ہم ان نامحرموں کو بلا لائے ہوں گے، پھر اتنا صبر بھی نہیں ہے کہ چھری کے نیچے دم لے کر تان تماشے دیکھیں۔ آپ ہی کوئی دم میں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کون ہیں اور کیوں کر یہاں آئے۔ خواجہ بہلول نے کہا کہ بڑی بی! کیا پوچھتی ہو؟ ہم سے پوچھو! یہ دونوں شاہ زادے ہیں اور ہم ان کے عیار ہیں۔ سیر و شکار کو آئے تھے۔ باغ دیکھ کر گل گشت کے واسطے چلے آئے۔ شاہ زادیوں کے حسن و جمال کو دیکھ کر غش آ گیا، اس لیے بارہ دری میں اُٹھا لے آئے کہ مزاج درست ہو جاوے تو ہم اپنی راہ لگیں۔ تم کہو کہ تمھارا مطلب کیا ہے؟ تم کو بھی اپنی جوانی یاد ہے کہ نہیں۔ سچ سچ کہو تم نے بھی عالمِ شباب میں کسی جوانِ رعنا کو دیکھ کر غش کھایا تھا یا قدیم سے بوڑھی ارواح ہے؟ خواجہ جو دایہ کو بنانے لگا تو شاہ زادیاں اور وزیرزادیاں ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئیں۔ دایہ تو اپنا سا منہ لے کر چپکی ہو رہی مگر ہم راز بانو اور محرم راز بانو بولیں کہ سچ ہے! ہر فرعونے راموسیٰ، اب نہیں (کذا) دایہ جی بڑبڑاتی نہیں ہیں۔ جوانوں کو دیکھ کر اپنی جوانی یاد آتی ہے، بڑھاپے پر افسوس کرتی ہیں۔ اگر آج جوان ہوتیں تو کوئی ان کو بھی دیکھ کر غش کھاتا (کذا)۔ ان کے محبوب پر بھی گلاب و عرقِ بید مشک چھڑکا جاتا۔ آؤ دایہ جی تم پر میں غش کھاوں تمھیں اپنا معشوق بناوں! گلاب و کیوڑہ (کذا) تم مجھ پر چھڑکو! زیادہ نخرہ نہ کرو! دایہ کھسیانی ہو کر بولی کہ اے بیٹا! تم غش کھاو اپنی ماں خالہ پر، میں تو تمھاری دادی کے برابر

ہوں اور نخرہ تو تمھاری ماں خالہ کرتی ہوں گی۔ خواجہ نے کہا کہ اگر آپ میری دادی ہیں، تو میں اپنے دادا کی طرف سے غش کھاوں گا، مے محبت پلاؤں گا۔ پھر سب ہنسنے لگے۔ دایہ پشیمان ہوکر بولی کہ لو بتو! میں یہاں سے جاتی ہوں، مجھ کو حیلا بننا منظور نہیں ہے کہ تمھارے پاس رہوں۔ خواجہ نے کہا کہ حیف ہے! دادی ہوکر پوتے کی بات کا برا مانتی ہو، خوش ہوکر سجدۂ شکر کرو کہ خدا نے یہ دن دکھایا کہ پوتا اختلاط کرنے کے لائق ہوا۔ خورشید لقا نے کہا کہ پھر تم کاہے کو جوانوں کے منہ لگتے (لگتی) ہو؟ الگ بیٹھو! بوڑھی کو لازم نہیں ہے کہ جوانوں کی صحبت میں بیٹھے۔

(۵) ہرگاہ، پارس لشکر گاہِ شاہنشاہ ہوا۔ جمشید شاہ آتش پرست یہاں کا فرماں روا ہے اور بڑا متعصّب بے حیا ہے۔ جو ملک اہلِ اسلام کا فتح کرتا ہے، بندے وہاں کے زندانِ جمشیدی میں مقید ہوتے تھے (ہیں) اور ہر روز صبح دم ۸ے مسلمانوں کو قتل کر کے سران کا آتش کدہ میں چڑھاتا ہے، چناں چہ اب بھی زندان کدۂ جمشید میں ۲ لاکھ سے زیادہ مسلمان مقید ہے۔ شاہنشاہ نے حکم دیا کہ اسی وقت خواجہ ٹھٹول و مہتر سریع السَیر نامہ لے کر اس گبرِ متعصّب کے پاس جاویں اور جلد تر جواب لاویں، اور نامے میں لکھا جاے کہ بہ مجرد دریافتِ مضمونِ نامہ، اسیرانِ زندان کدۂ جمشیدی کو کہ مطلق مسلمان ہیں، نامہ بروں کے ساتھ حضور میں بھیج دے اور آتش کدوں کو ٹھنڈا کرے، نہیں تو اس کے خون سے آتش کدہ سرد کیا جاے گا اور جس قدر آتش کدہ پارس میں ہیں (ہے) اگر ۸ روز کے اندر پانی اُن پر نہ پڑے گا تو صاحبِ آتش کدہ کے لہو سے آتش کدہ بجھانے میں آے گا۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئے۔ خواجہ و مہتر نامہ لے کر قلعہ کے دروازے پر پہنچے۔ کشکچیان قلعہ کے داروغہ نے کہا کہ تمھارے لباس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم مسلمان ہو اور بادشاہ ایسا متعصّب ہے کہ مسلمانوں کی صورت نہیں دیکھتا۔ از راہِ ترحم کہتا ہوں کہ یا تو نامہ مجھ کو دو کہ میں لے جا کر شاہ کی خدمت میں گزران دوں یا اپنے بادشاہ سے کہیے کہ کسی گبر کے ہاتھ بھیجے۔ خواجہ نے کہا کہ ہمارے شہنشاہ کے یہاں گبر و ترسا و پارسی و نصرانی و یہود و مجوسی و ہنود کا گزارہ کہاں کہ اس کے ہاتھ نامہ بھیجا جائے اور یہ بھی غیر ممکن ہے کہ ہم نامہ تجھ کو دیویں۔ وہ بولا کہ تو تو آپ کی جان بے اجل گئی۔ خواجہ بولا کہ ہمیں تُو جانتا ہے کہ ہم کون ہیں؟ اُس نے کہا کہ بھلا میں کیا جانوں کہ آپ کون ہیں؟ خواجہ نے کہا کہ نہیں جانتا ہے تو اب جان۔ ہم دونوں نائبِ ملک الموت ہیں تیرے بادشاہ بے وقوف کی روح قبض کرنے کو مسلمان آئے ہیں۔ جا اس طرح سے کہہ دے اور کہنے میں کچھ تشویش ہو تو پہلے تیری روح قبض کریں۔ وہ گھبرا کر دوڑا گیا [اور اس نے سب حال کہا]..... جمشید شاہ نے حکم دیا کہ دو پہلوان جا کر نامہ بروں کا سر کاٹ

لاویں..... برزدو بیجو، دو پہلوان، کہ ہر ایک دو ہزار پہلوان سے تنہا میدانِ کارزار میں مقابلہ کرتا اور مظفر ہوتا تھا، داروغہ کے ساتھ گئے۔ دیکھا کہ منجنی سے دو شخص ادھیڑ کاغذ کی دو سپریں پشت پر لگائے گوپھن اور لچھا کمند کا بائیں ہاتھ میں لیے، خنجر کمر میں، نیچے ہتوانسے کھڑے ہیں۔ برزدو بیجو نے قہقہہ مار کر..... پوچھا کہ یہی نائبِ ملک الموت ہیں..... خواجہ بولا کہ کیا تم بھی دنیا سے سیر ہوئے ہو کہ پوچھنے کو آئے ہو..... پہلوانوں نے داروغہ سے کہا کہ جلد جلاّد کو بلواؤ، ہم ان کو پکڑ دیتے ہیں۔ خواجہ و مہتر نے دس قدم پیچھے ہٹ کر ایک سنگ تراشیدہ و خراشیدہ، سردیِ ماہتاب دیدہ و گرمیِ آفتاب چشیدہ، پہاڑ کی ندی کے پانی سے پرورش پایا ہوا۔ کفہ فلاخن میں رکھ کے ۷ مرتبہ گھما کر برزدو بیجو کی آنکھ پر جو مارا، آنکھ گدی سے نکل گئی۔ برزدو بیجو آگے کو جو اس ارادے سے بڑھے کہ ان کو پکڑ لیجے، خواجہ و مہتر نے دوسری آنکھ کو بھی ہدف کیا۔ [یہ دونوں جمشید شاہ کے پاس گئے۔ اس نے ۱۰۰ پہلوان بھیجے۔ یہ سب مارے گئے۔ یہ سن کر بادشاہ نے ایک دستہ غلاموں کا بھیجا۔ دستے کا دستہ مارا گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ سو مست ہاتھی لے جا کر انھیں گھیر کر مار لو! تو خواجہ و مہتر نے سب کی سونڈیں کاٹ دیں۔ ہاتھی چنگھاڑیں مارتے ''جدھر تدھر'' بھاگے۔ دو تین صحنِ بارگاہ میں گھسے، جو سامنے پڑا اُسے دانتوں سے ہلاک کیا] ۹ے..... جمشید شاہ ششدر ہو گیا، بولا کہ عجب نہیں اگر نامہ بر نائب ملک الموت کے ہوں کہ کام بشر کا نہیں ہے جو اُن سے ظہور میں آیا۔ [بہروز وزیر اعظم نے مشورہ دیا کہ نامہ بر بلوا لیے جائیں، سامنے آئے تو اُس نے دریافت کیا کہ نامہ کس کا ہے۔ جواب سن کر نامہ طلب کیا تو خواجہ نے کہا: ''تعظیم و ایثارِ نامہ بجالاؤ'' یہ بھی کرنا پڑا، منشی سے خط پڑھوا کر سنا تو جمشید شاہ بولا کہ مہر عالم سے میرے بہت سے خراج گذار ہیں، وہ بکتا کیا ہے۔ خواجہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور کہا کہ بے ہودہ گو کی زبان کاٹی جاتی ہے] ۸۰..... جمشید نے غضبناک ہو کر کہا کہ ہاں! اس بے ادب کی زبان گدی کے پیچھے سے نکال ڈالو! یہ کہنا تھا کہ اور خواجہ کا جست کر کے تخت پر پہنچنا تھا۔ جمشید شاہ کا تاج اُتار کر طریق (کذا) سے ایک چپت سر پر دی اور بولا کہ بے اَدب کی یہی سزا ہے۔ مزدک! چھوٹا منہ اور بڑی بات، کیا کروں کہ شاہنشاہ کا حکم نہیں ہے کہ (کذا) نہیں ابھی زبان تیری کاٹ ڈالتا۔ تمام دربار تلے اوپر ہو گیا۔ ہر ایک تلوار کھینچ کر دوڑا۔ خواجہ اور مہتر تاجِ روپوش سر پر رکھ کر اپنے لشکر کو چلتے ہوئے جب پتا نہ لگا، کوئی تو بولا کہ نفس الامر میں یہ فرشتے تھے، کسی نے کہا: فرشتے نہیں تو جنّات تو مقرر تھے، یہ کام بشر کا نہیں ہے کہ جمشید شاہ سے بادشاہِ ذی جبروت کو آسیب پہنچا کر اتنے آدمیوں کی نگاہ سے الوپ ہو جائے''۔

(۶) مہتر ساطور کی شامت جو آئی ککڑ کی فرمائش کی۔ جھٹ پٹ ککڑ خالص کی چلم تیار کر کے پہلے تو دم آپ لگایا بعد ازاں ساطور کو دیا۔ چوں کہ وہ چلم خواجہ ہی کے دم لگانے میں سلفہ ہوگئی تھی، ساطور نے جو پیا ۸۱..... تو بولا کہ بھائی تمھارا چلم لینا اور بھوانی کا آنکھ لینا (کذا) برابر ہے، اب دوسری چلم داغو..... ککڑ نکال کر دوسری چلم تیار کی اور کہا کہ پیجیے، پہلے آپ ہی گلزار کیجیے!..... دو ہی دم میں چکر آ گیا، تین تلوک سوجھنے لگا۔

اور بزدلوں اور تھڑجیوں کی جان پر بنی تھی، دست پر دست ہویوں سے چلے آتے تھے۔ کہتے تھے کہ الٰہی! ہماری جان کی خیر بھیجو! ہم نے تو کبھی جوں بھی نہیں ماری، آدمیوں کے مارنے کا سامان ہو رہا ہے۔ یہ کیا جانتے تھے، نہیں تو کوچ کے وقت وہیں سے چل دیتے۔ اپنے اپنے سائیں (سائیس) سے کہنے لگے کہ پچھلی پہر رات رہے گھوڑے پر زین کس دینا کہ ہم ٹھنڈے ٹھنڈے تاروں کی چھاؤں میں اپنے گھر کا راستہ لیں۔ خبردار! بھور نہ ہونے پائے کہ ہماری بھور ہو جائے۔ سائیسوں نے کہا کہ یہاں ایسا جی کیوں مارے دیتے ہو! سپاہی تو ایسے دن کو منایا کرتے ہیں کہ صفِ جنگ ہو تو لڑیں، ماریں مریں، باپ دادے ۸۲ کا نام روشن کریں۔ آقا کی قدردانی سے ایک اپسی سے دو اپسی، سہ اپسی ہو جائیں، خلعت و جاگیر پائیں۔ اگر ہاتھ پاؤں کٹ کرا اپاہج ہو جائیں تو انگلس ۸۳ لے کر زندگی بھر بیٹھ کے کھائیں۔ لڑ کے بالوں کو اپنے عوض نوکر رکھوائیں، اور یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ تم مارے ہی جاؤ گے؟ دیکھو ہم چنے دلتے ہیں تو اکثر چکی سے سابوت نکلتے ہیں۔ ہمت کو نہ ہارو! نہیں تو کل ہم چشموں سے شرماؤ گے۔ لوگ تمھیں دیکھ کر کھنکاریں گے، تڑاوا ماریں گے، لشکر میں رہنا دوبھر کر دیں گے، ساتھوں (ساتھیوں) کے ہاتھ سے زندگی وبال ہو جائے گی، سوا نوکری چھوڑنے کے کوئی بات نہیں آئے گی۔ بیٹھے بٹھائے کیوں اپنے کو خراب وتباہ کرتے ہو؟ دھڑکوں سے کیوں ڈرے مرتے ہو؟ آنکھیں کھول کر دیکھو! لشکر میں اور بھی اپنے یہاں کے پوت ہیں۔ کوس جوبی [کذا] کی صدا سن کر کیسے خوش ہوتے ہیں، ہتھیاروں کو اپنے درست کرتے ہیں۔ لڑائی کے نام پر مرتے ہیں، معشوقۂ ظفر کو دیکھنے دکھانے کو سرمہ آنکھوں میں لگاتے ہیں، پان چباتے ہیں، اور اگر تم کو ایسی جان پیاری ہو تو سپاہیوں میں نام کیوں لکھوایا؟ اتنی مدت سے درماہہ کیوں کھایا؟ وقت پر دغا دینا اشرافوں کا کام نہیں ہے، جہاں تلوار چلتی ہے، بہادروں کا ٹھکانا وہیں ہے۔ اگر آج جان لے کر بھاگ جاؤ گے تو سپاہیوں کی روٹی گنواؤ گے، ایک کرتا ہے تو دس بدنام ہوتے ہیں، کرنے والے کی جان کو روتے ہیں؟ اور خود بھی جہاں کہیں جاؤ گے، نوکری نہ پاؤ گے، نامردے کہلاؤ گے۔ بولے کہ ابے مردک! دیوانہ ہوا ہے، تو سسرا ہے کہ سالا ہے جو شیخ سعدی کا ''پندنامہ'' کھولا ہے! ابے! کیا ہم نے آپ سے سپاہ گری میں چہرہ لکھوایا تھا؟ خدا بُرا کرے اماں

چنبیلی خالہ رائے بیل کا، خرچیاں جاکرکوڑی جمع کی، جب آپ کسی قابل نہ رہیں تو گھوڑے مول لیے۔ جس تس کی بہو بیٹیوں کو ملا کر بخشی جی سے گھوڑے داغ کروائے، ہمارے اسم لکھوائے۔ آپ تو بڑھاپے میں چپٹی لڑتی ہیں، یہاں خونخواروں سے لڑنے کو بھیجا ہے۔ باوجود جاننے کے بوانے جب کبھی فصد کھلوائی ہے تو ہمیں خون دیکھ کر غش پر غش آیا ہے، پہروں ہوش نہیں رہا ہے، ہم سے اور خوں ریزی سے کیا علاقہ۔ چڑیا ہمارے سر سے اُڑ کر جاتی ہے تو ہم جانتے ہیں، گولی آتی ہے، کیچڑ پانی میں لیٹ جاتے ہیں، مردوں میں اپنے کو شمار کرواتے ہیں، سو ہم، جہاں گولی برسے، تلوار چلے، وہاں جائیں، اپنی سونا۸۴سی جان گنوائیں۔ تو اگر بڑا خیر خواہ ہے تو جالی کھرپا ہم کو دے! کل ہم گھوڑے کی گھاس۸۵ چھیل لادیں گے تو کپڑے ہتھیار پہن، باندھ کے گھوڑے پر سوار ہو کر تلوار کے منہ پر چڑھ، اگر جیتا بچے گا تو (جو) کچھ انعام ملے گا، تُو ہی لینا۔ منہ سے کہہ دیتے ہیں۔ تجھ پر کیا آفت آئے گی، ہماری ٹوئیاں سی جان جائے گی، اور ہم کو تو ایسے لشکر خوں خوار میں رہنا منظور نہیں ہے کہ کوئی تڑادا پھینکے گا یا بولی ٹھولی مارے گا۔ ہماری جان بچے گی تو دیا سلائی سرکنڈوں کی بنا کر بیچ کھاویں گے، یوں بے اجل تلوار کے منہ مارے تو نہ جاویں گے، اور چنوں کی مثال جو دیتا ہے تو ہم کو دلے ہووں میں سمجھ! تجھی کو مثل یاد نہیں ہے، ہم کو بھی یاد ہے، نہ سنا ہو تو سن لے، گیہوں کے ساتھ گھن بھی پیسا جاتا ہے، سو ہم گھن ہیں اور یہ سپاہ جو لڑتی مرتی ہے، گیہوں ہے اور اتنے دنوں جو اس لشکر میں ہماری گزری، اوّل تو لڑائی کا سامان نہیں بندھا، کبھی ہماری قسمت سے کوئی غنیم نہیں چڑھا، اور اگر اتفاقاً کسی ایسے ویسے سے بگڑی ہے تو ہم بھاگتوں کے اگاڑی اور مارتوں کے پچھاڑی رہے۔ اب سامنا بے ڈول ہے، اسی سے آتا ہم کو ہول ہے، اور تُو تو خدا سے چاہتا ہے کہ اگر دشمنوں (کذا) دور پار ہم مارے جائیں تو ہمارا کپڑ التّا، گھوڑا لے کر لتی کرے۸۶۔ سو تیرا چیتا۸۷ خدا نہ کرے گا تو اسی ارمان میں مرے گا۔ دیکھ! خبردار! صبح ہونے نہ پائے کہ گھوڑا ہم کو کسا کسایا ملے!"

(۷) مہندی کے دوسرے دن برات اس لطف سے چلی کہ ذکر اس کا زبانِ قلم سے ہونا دشوار ہے مگر میں ایک حصّہ لاکھ حصّے سے لکھتا ہوں کہ بیان اس کا ناچار ہے...... واضح ہو کہ مینا حصار سے رامنے تک دورویہ ٹھٹر جو بندھا ہوا ہے، اس میں قمقمے یاقوت و زمرد و پکھراج و نیلم کے لٹکائے تھے اور ٹھٹروں کے درمیان میں دوطرفہ آتش بازی کی گاڑی تھی۔ تکلف یہ تھا کہ دھواں آتش بازی سے نہ نکلتا تھا اور کئی لاکھ دیو بین السماء والارض آتش بازی چھوڑتا جاتا تھا، اور سڑک کی آتش بازی کے آگے دونوں جانب چمن بندی روشنی کی اس صنعت سے کی تھی گل و غنچہ سے لَو روشنی کی بہ رنگِ فتیلۂ کپاس نکلتی تھی اور ہزاروں تخت روشنی کے ہوا پر جاتے تھے۔ اور مینا حصار سے رمنے تک دورویہ تخت رواں رقاصاں پری نژاد۸۸ کے

قائم کیے تھے۔ پہلے مراتب وعلم ہائے ماہ پیکر ومہر منظر کو، کہ ہوا کے لگنے سے یا صاحب قران اکبر ۸۹ یا صاحب قران اصغر دہنِ ماہیِ مراتب ۹۰ سے آواز نکلتی تھی، نکالا ۹۱۔ پیچھے اس کے کئی ہزار تخت نو بتوں کا، کہ جھڑ جھڑ نوبت شادیانہ بجاتے جاتے تھے، رواں ہوا۔ اس کے پیچھے بلم بردار، برچھی بردار، برق انداز، خاص بردار چقماقوں کو کہ زربفت مغرق کے غلاف اُن پر چڑھے ہوئے تھے، کاندھے پر رکھے اور پیادے بندوقیں فتیلہ دار لاہوری داغتے نکلے۔ اس کے بعد کئی ہزار شبدیز، کوتل، نقرہ رخنگ ۹۲ سنجاب، سرخہ، سبزہ، گل زار، ابلق ہمند یسہ، زالف، سرنگ، تیلیا، کشمشیہ، کمیت، شرغہ، پچکلیان، مشکی، سورچال، گرہ، بھمرا، دکن، کاٹھیاواڑ، کچھ، جنگل، عراق، تاتار، عرب، عجم، آوا، رنگون، ہردوار ودری، جادۂ ترکستان کا زین مُرصّع بجواہر پشت پر، اس پر غاشیہ مخمل سرخ وسبز وزرد آبی وسیاہ زنگاری، کاسنی، ابری، نافرمانی، سردئی، کوئی، شتری سفید کا چار حاشیے میں جواہر، بقیہ (بخیہ) کیا ہوا سری پوری پٹا، کلغی توره، ہیکل، پیش بند، گلوبند، زانو بند، سجن، دمچی، مرصّع ریشمی زیر بند کار چوبی سڑکیں چھوڑ، گجگا ہیں لگائے، جال رنگ برنگ کے گرد موتیوں کی جھالروں کے پٹھوں پر ڈالے، کلائیاں مارنا، بہ رنگِ طاؤس طناز کندہ کرنا، بعد ازاں چوب دار، پسناول، نقیب، سونٹے بردار، عصا بردار، چھڑی بردار، مرد ہے، دور باش، میدانی، ادب سے ''تفاوت عمر و دولت زیادہ، ردّ بلا رہے''، بولتے چالتے چلتے جاتے تھے، اور شاہ زادۂ ماہ عالم صاحبِ قران اصغر خلعتِ نوشاہانہ مغرق بہ جواہرِ دامادی کا پہنے، موتیوں کا سہرا لعلوں کی سراسری میں گندھا ہوا، سر سے باندھے، سرخ رومال زرتار منہ پر رکھے مرکبِ باد پا پر سوار جس طرح حلقۂ انجم میں ماہ یا حلقۂ انگشتری میں نگینہ ہوتا ہے، شاہانِ پردۂ قاف کے حلقے میں تھے، اور مہتر سریع السیر وقمر سیرِ تیمتاج مرصّع کہ جس پر ایک تو تازمرد کا مجوف پُر از مشک وعنبر یا صاحبِ قران اکبر! یا صاحبِ قران اصغر، جگ جگ جیو، بادہ عیش وعشرت پیو!'' بولتا تھا، اور جیغہ وکلغی واطاقۂ جواہر نگار پوستِ آہوے خطائی کا آفتاب گیر نصب کیا ہوا سر پر رکھے ہوئے، حریر وکتان کے پیرہن جڑاؤ گھنڈے لگے ہوے، گلے میں بے میانی کا تنبان پاوں میں پہنے، اس آفت بند گل بوٹے کا لعل کا تکمہ لگا ہوا باندھے کمر زریں میں، کیسۂ قارورہ، نفطہ وحقہ موم، روغن تریاق کی ڈبیا، شیشی عطرِ فتنہ کی رکھی، چادر عیاری کی مشبک دام ماہی، کہ حریف کو اس میں باندھیں تو دم خفانہ ہو، کمر سے لپٹے، خنجر وقرولیاں الماس ویاقوت وزمرد کے دستوں کی زیرِ ناف کھونسے، نیچہ الماس پارہ برق تمثال ڈاب میں ڈالے، مہری ریشم سے گندھے ہوئے رانوں میں باندھے، گردہ سپر مانند قرص آفتاب پسِ پشت، کمان وترکش وزنبیلِ ومشکیزہ پانی کا کاندھے سے لٹکائے، قنطورۂ زربفتی پستادۂ سقرلائی کمر سے لگائے، جفت پاپوش روئی سے زیادہ نرم اس پر خاک انداز مخمل کا نصب کیا ہوا پہنے مگس راں دم طاؤس ولچھا کمند کہ جس کے ہر حلقے میں یاقوت و

زمرد کے کہرنس تھیں، دستِ چپ میں لیے، شمشیرِ جوہر بار دستِ راست میں، ہتوانسے چپ وراس فتراک تھانبے، چھ آواز، بارہ مقام، چوبیس شعبے، اٹھائیس گوستے ذیل میں خوش الحانی سے زمزمے کے ساتھ ادا کرتے، نوشہ کے ہمراہ تھے اور شاہزادۂ مہر عالم صاحب قران اکبر قدم قدم پر زر و جواہر اپنے نوشاہ بھائی پر نچھاور فرماتے تھے۔

سہیلیاں سمجھانے لگیں کہ رانی صاحب! اس خیال سے درگذرو! لادت ومنات کو اپنے سے ناراض (نہ) کرو! یہ شخص تمھارے دیوتا کا دشمن ہے کہ تُرک ہے۔ رانی روپ سندر بولی کہ اگر وہ تُرک ہے تو میں تُرکن ہوں۔ وہ جس کا دشمن ہے تو میں کب اس کی دوست ہوں۔ ایک داسی بولی کہ رام رام کرو! رانی صاحب! ملیچ ۹۳ سے محبت کر کے کیوں اپنی ذات گنواوگی، ماں باپ کو نرک ۹۴ میں جلاوگی۔ رانی بولی کہ اگر تم لوگ میرے پیچھے پڑوگی تو میں تم پر ہتیا دوں گی۔ جاؤ! اپنی اپنی راہ لو! [اس کے بعد لڑائی کا ذکر] کنچن رائے طبلِ بازگشت بجوا کر باڑے کو پھرا..... رانی روپ سندر ایک جوتی کی بیٹی سے پوچھ رہی تھی کہ دیکھو تو! یہ غنیم، جو مہاراج پر چڑھا ہے، جیت ہار اس لڑائی میں کس کی ہے! اُس نے بچار کر کہا کہ آج کل مہاراج کا ستارہ نحوست کے کنڈل میں ہے، نجوم بولتا ہے کہ مہاراج کی شکست ہو اور غنیم کی چڑھ بابے ۹۵۔ روپ سندر بولی کہ اے جوتن! میری راس کو تُو بچار! میرے کرم میں کیا بدا ہے۔ وہ شمار کر کے جیب کو دانتوں میں دبا کر رہ گئی۔ روپ سندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا تجھ کو تیرے ۹۶ ماتا پتا کی کریا دیتی ہوں، اگر تو میرے کرموں کے لکھے کو چھپاوے، سچ سچ بتادے۔ وہ بولی کہ بھوانی آپ کے داہنے اور سرستی مکھ پر ہے۔ نرنکار سدا بول بالا رکھے گا، پراتی ستارے کی کھونٹ ہے کہ ملیچ کے گھر میں راج کرے گا، اور اس کو دیر نہیں ہے، بہت جلد ایسا ہوگا۔ رانی..... اپنے دل میں مگن ہوئی۔

اختک بولا: لات ومنات پرست کی بیٹی نادیدہ خدا پرست کو کیوں کر بیاہی جاے گی۔ وہ کیسا شاہنشاہ ہے کہ جس نے اپنے بیٹے کو امتیاز تک تحریر وتقریر کا نہیں دیا، خورشید شاہ سے بادشاہِ ذی جبروت کو لکھا ہے کہ اگر عقد نہ کروگے تو شرم ساری ہوگی۔ جا! اس کا جواب یہی ہے کہ غیر کف کے ساتھ شاہ زادی کا بیاہ نہیں ہوسکتا ہے۔ مہتر سریع السیر بولا کہ او اسفل بدتمیز! تجھ کو کیا اختیار ہے کہ دخل در معقولات کرتا ہے۔ حقیقت میں اگر جنسِ عالی سے ہوتا تو بادشاہوں کے مقدمے (میں) سمجھ کر کلمہ وکلام کرتا۔ الحق! صغرا و کبریٰ میں بڑا فاصلہ واقع ہوتا ہے۔ اور وزیر تو پایۂ تخت سے لگے کھڑے ہیں، کسی نے مثل تیرے ایسا ثقیل کلمہ

صرفِ زبان نہیں کیا۔ بہرحال، الماضی لایذکر، آئندہ اگر ایسا سخنِ خفیف منہ سے نکالا تو نتیجہ اس کا سخت بد دیکھے گا، قضیہ منعکس ہو جائے گا۔ جتنے عالم و فاضل و علانیں، جملہ وکلائے دیار و اعصار [امصار] دربار میں حاضر تھے، اپنے دل میں کہنے لگے کہ نامہ بر تو بڑا منطقی ہے، یقین ہے کہ اس کا شاہ زادہ بھی عالمِ متبحر ہوگا۔

بے دھڑک باغ کے اندر قدم دھرا۔ جس طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے، نظر کو طراوت حاصل ہوتی ہے، ہوائے سرد خشکی دماغ کو کھوتی ہے، چمن چمن گُل بن میں شاخ شاخ پر بلبل بیٹھی چہچہا رہی ہے، روشوں پر دورویہ سرو و شمشاد و صنوبر و عرعر کی قطار ہے، قمریوں کی کوکو کی تکرار ہے۔ ہر چمن کے گوشے پر مولسری کے درختاں مقرض کی بہار ہے، اس پر ہر قسم کا جانور بیٹھا ہوا بادۂ زمزمہ سے سرشار ہے، جدھر درختانِ انبہ کا ہجوم ہے، اُدھر کوئلوں کی دھوم ہے، تمام باغ میں نخل پر ثمرا اپنے اپنے موقع پر لگے ہوئے ہیں، قسم قسم کے طیور بیٹھے ہوئے ہیں۔ خیاباں (میں) آبجوئیں موج زن ہیں، کناروں پر جانوروں کے نشیمن ہیں، نافِ باغ میں ایک بارہ دری سنگِ مرمر کی ایسی مصفّا ہے کہ جس پر پائے نظر پھسلتا ہے، فصیلِ سقف پر طاوسانِ سفید کی قطار کھڑی ہے، ہر ایک کی چونچ میں گوہرِ شاہوار کی لڑی ہے، بارہ دری کے چاروں کونوں پر حوضِ سنگِ مرمر و یاقوت و پکھراج کے ہیں، ہزارے فوارے لگے ہیں، خزانوں سے جو پانی فواروں میں جا کر اُچھلتا ہے، خفقانی کا دل اس کے نظاروں سے بہلتا ہے، دروں میں مشجّر کے پردے لگے ہیں، گنگا جمنی تیلیوں کی چلونیں کلابتوں سے گندھی ہوئی پڑی ہیں، کرمانی کاشانی قالینوں کا فرش ہے، جا بجا چھپر کھٹ، پلنگ، کونچ، دنگل، بانگ مرصّع کار بچھے ہیں، اُن کے آگے پتالیوں پر گل دستے مرصّع گل دانوں میں رکھے ہیں۔

ملکۂ عالم آرا، شاہ زادی کے دیکھنے کی حد سے زیادہ مشتاق ہوئی۔ دایہ کو بلا کر پوچھا کہ دایہ جان! تم میرا لہو پیو، میری بھتّی پکا کے کھاؤ اگر سچ سچ نہ بتاؤ، بُت خانے میں کون محبوس ہے؟ دایہ بولی، بی بی! وہ جو دو شاہ زادے مسلمان تمھارے باپ سے لڑنے آئے ہیں، اُنھیں میں سے ایک ..... کو تمھارے باپ نے فریب و دغا سے قید کر کے میرے سپرد کیا ہے، کہا ہے کہ جب تک دوسرا بھائی اس کا گرفتار ہو، تب [تک] اس کو بہت حفاظت سے رکھو، جب وہ ہاتھ آئے گا، تب دونوں کو لات و منات پر سے بل بکرا دوں گا۔ ملکہ بولی کہ ..... تو میرا موا منہ دیکھے اگر اس کو ایک نظر ..... نہ دکھا دے ..... ہر چند دایہ نے انکار کیا لیکن شاہ زادی نے نہ مانا۔ دایہ بولی: دیکھو بنو، تم ہٹ کرتی ہو مگر کسی کے روبہ رو نہ کرنا کہ میرا بوڑھا چونڈا مونڈا جائے۔ ملکۂ عالم آرا بولی کہ بھلا یہ بات کہنے کی ہے ..... بت خانے میں جا کر شاہ زادے کو

دیکھا۔ دیکھتے ہی کلیجا پکڑ کے بیٹھ گئی، بولی کہ اُف! اس کے تیرِ مژگاں نے تو میرے کلیجے کو دوسار کر دیا۔ دایہ کے تو چھکے چھوٹ گئے، لگی شش و پنج کرنے کہ بڑی چال جو کی اس نے تو اس کھلاڑی کو دیکھ کر بساط محبت کی بچھائی، اگر ابھی بادشاہ سن پاتا ہے تو حریفانہ مجھے تین تیرہ کر دیتا ہے، عالم آرا سے بولی کہ چلو بنو، اُٹھو! کوئی اپنے باپ کے دشمن سے جی ہارتا ہے۔ یہ کہہ کر لگی سر دُھننے اور کہنے کہ تمھاری تو ہر صورت سے پو بارہ ہیں کہ تم بادشاہ کی بیٹی کو مگر میں گور میں سلائی جاؤں گی۔ حیف ہے کہ میں پکی ہو کر کچی ہو گئی۔ عالم آرا نے پاوں پھیلائے، دایہ سے کہنے لگی کہ اب میرا اور شاہ زادے کا جگ بندھا۔ مثل مشہور ہے کہ جگ چھوٹا اور نر و ماری گئی۔ مجھ کو اس سے الگ کرو گی تو میں کچھ کھا کر گھر میں سو رہوں گی۔ اب اسی میں پانسا تمھاری جیت کا ہے کہ مجھے عشق بازی کرنے دو! ابھی سترہ اٹھارہ برس اس کا سن و سال ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن''۔ اناڑیوں کے ہاتھ سے مفت مفت مارا جائے۔ ہر چند دایہ نے سمجھایا لیکن ملکہ کے خیال میں نہ آیا۔ تب تو ناچار ہو کر کہا اچھا! اس کا منصوبہ کیا جائے گا۔ فرزین کی طرح یہ کج روی اچھی نہیں..... اگر..... بادشاہ کو معلوم ہو جاتا ہے تو خود اسبوں میں سے تمھارے دادا کا نام بھی کٹتا ہے اور مجھ کو بھی پیل کے پاوں میں بندھوا کر وزیر دوم جو دا ڈالتا ہے۔ اس صورت میں تمھاری بھی بازی جیتی ہوئی مات ہوتی ہے۔ عالم آرا رُخ بدل کر بولی کہ تبھی یہاں سے چلوں گی جب قید اس کی تم کاٹ دو گی۔ آخر دایہ کو ایسا زچ کیا کہ اس کو قید کاٹتے ہی..... بن آیا۔

خواجہ کو منصوبہ سوجھا، ایک عیار کو بالکا بنا، خطِ آزادی ماتھے پر کھینچ، تان سوزنی سر پر رکھ کفنا پہن تہمت لنگ پر باندھ ڈیڑھ ۹۷ ہاتھ کی بیراگی مُخشاخی، دو ہاتھ کا بغدہ بغدادی بغل میں رکھ، رشیدہ، کشنا، چھڑی، رومال اوداسی کا ہاتھ میں لے کر سیلی، منکا ٹھنکا گلے میں ڈال سُمرن سلیمان ہاتھ میں، صبحی (صبح ہی) قلعے کے دروازے پر جا کر کھڑا ہوا۔ ہزبر شاہ..... قلعے سے نکلا، خواجہ نے عشق اللہ! یا اللہ! کر کے کہا کہ آج تو صبحی (صبح ہی) اللہ والے لوگوں کی صورت نظر پڑی ہے، کہو بابا! کچھ فقیروں سے بھی واحد شاہد ہوتا ہے؟ ہزبر شاہ نے..... پوچھا کہ داتا! کہاں سے آنا ہوتا ہے اور نام و نشان کیا ہے؟ خواجہ بولا کہ مثل گوزشتر نہ زمین سے نہ آسمان سے، فقط لامکان ہے، مگر ہاں! ظاہرا مرشد کا ڈھیر بغداد میں ہے۔ شیدائی قلندر کہہ کر مرشد نے پکارا ہے۔ ہزبر شاہ بولا کہ اچھا داتا! قلعے میں چل کر بستر لگائیے میں بھی کسب ہوا کر کے آتا ہوں۔ خواجہ بولا: اچھا بابا! معبود خوش رکھے! پھر کبھی فقیر کا گذر ہو گا تو دیدو ادید ہو رہے گی! تجھ کو سنا تھا کہ فقیر دوست ہے، اس سے فقیر کے دل میں آیا کہ چل کر دیکھا چاہیے مگر یہ مثل سچ ہے کہ دور کے

ڈھول بڑے سہاونے ہوتے ہیں۔ ہزبر شاہ عطف عناں کر کے (گھوڑے پر سوار تھا) فقیر کو قلعے میں لے گیا..... خواجہ نے چپا چپا قلعے کا دیکھ ڈالا۔ فصیلوں پر جا کر دیکھا کہ مورچالوں میں پہلوان بیٹھے ہیں۔ ماتا متوالا تیل کے کڑھاو، پھوس کے پولے، باروت کی ہانڈیاں، دال کی مٹکیاں، روغن نفط کے قارورے جابہ جا دھرے ہیں..... ہزبر شاہ آیا، پوچھا کہ داتا! کچھ نشے پانی سے بھی شوق ذوق ہے، بولا کہ فقیر کو تو کسی نشے سے شوق نہیں ہے مگر ہاں! شب کو دُدھا پیتا ہے؟ پھر پوچھا: دیسی یا ولایتی؟ بولا کہ حاضر میں حجت نہیں۔

فغفور شاہ دمع ہو کے چین بہ جبیں ہوا، بولا کہ مہر عالم جو اپنے کو شاہنشاہ سمجھتا ہے، یہ وہی مثل ہے کہ اپنے منہ سے دھنّا بائی۔ مہر عالم سے بہتیرے جام بردار میری سرکار میں ہیں۔ اس کو لازم ہے کہ رومال سے ہاتھ باندھ کر حاضر ہووے اور قصور بخشواوے، نہیں تو گوش مالی دی جائے گی۔ خواجہ بولا کہ کچھ خیال میں نہیں آتا، کہ تو کیا راگ ہے گا تا۔ تجھ سے چینی نواز، کاسہ لیس، گھت تال بجانے والے ہمارے شاہنشاہ کے ہاں بے شمار ہیں۔ معلوم نہیں کہ تجھ کو کس احمق نے تعلیم کیا ہے کہ بے وقت کا راگ الاپتا ہے، اور بیری اپجیں لیتا ہے۔ دیکھتا ہوں کہ آخر تیری اس کوڑھ پُر تالی بجے گی گوش مالی پر گوش مالی ملے گی اور جب تیرے سر پر طبلے کی تھاپ پڑنے لگے گی تو تار نہ ٹوٹے گا، سب تان تماشے بھول جائے گا، چوتڑ بجا بجا کر تخت پر ناچنے لگے گا۔ دیکھ تو کیسی گت تیری بناتا ہوں کہ میرا نام سن کر تُو کان پکڑے۔

دونوں بھائیوں نے بارہ دری کے اندر قدم رکھا، دیکھا کہ دو معشوقین سیزدہ چہاردہ سالہ چوسر کھیل رہی ہیں۔ شاہ عالم نے ان کو دیکھ کر حوران شاہ سے کہا کہ لو بھائی! اب تو پو بارہ ہیں۔ جُگ اچھے ملے۔ شاہ زادیوں نے جو سر اُٹھا کر دیکھا، چار آنکھیں ہوتے ہی چھکّے چھوٹ گئے، بن مارے رنگ بدرنگ ہو گیا۔ ایسے حواسِ خمسہ تین تیرہ نوبانت (کذا) ہوئے کہ نرد ہاتھ کے ہاتھ میں رہی، چال چلنا بھول گئیں، کچی پکی کرنے لگیں۔ اُن کے شش و پنج کرنے سے شاہ زادوں کا داو بن پڑا، دل میں سوچے کہ شاہ زادیاں جی ہار بیٹھیں، بے تردّد اپنی جیت ہوئی، مخاطب ہو کر بولے کہ صاحب! سات پانچ دل میں کیوں کرتی ہو، مہمانانِ جاں باز سے بساطِ آشتی بچھاؤ! نردِ محبت کھیلو! ایسے شاطر کبھی دیکھنے سننے میں نہ آئے کہ پہلے ہی داو میں دل جیت لیا۔ پانسا تمھارے موافق پڑا، بے لڑے بھڑے بازی لے گئیں۔ شاہ زادیاں یا تو ششدر تھیں یا کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ (اس کے بعد شراب کا دور) دخترِ رز نے مشاطگی کر کے

جانبین کو بے حجاب کر دیا۔ پھر تو بے دھڑک بادۂ گل گوں پیتے پلاتے عنابِ لب کی گزک کھانے کھلانے لگے۔ (اس کے بعد شاہ عالم کا عیّار بلوایا گیا) نسیمِ نو بہار کو دیکھ کر باغ باغ ہو گیا، بولا کہ اے جان! دیدے تیرے انتظار میں سپید ہو گئے۔ ہر چند نسیم کو دیکھ کر نو بہار کا بھی غنچۂ دل شگفتہ ہو گیا مگر نسیم کے اے جان کہنے سے چین بہ جبیں ہوئی اور ملکہ کے رُو بہ رو آ کے کہا کہ عیار تو ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ ملکہ نے کہا کہ تجھے کیا کہا؟ نسیم نے ہاتھ باندھ کر التماس کیا کہ پیر و مرشد! غلام نے تو سوائے نظارہ کے اُن کو چھوا بھی نہیں۔ نو بہار بولی کہ چل خچر! یہ چھیڑ چھاڑ اور کسی سے کر! نسیم بولا کہ حضور انصاف کریں! نسیم و نو بہار کا تو چولی دامن کا ساہاتھ (ساتھ) ہے۔ نسیم اگر نہ لگے تو کلی کیوں کر کھلے! بل کہ شمس النساء بولی کہ نسیم تو سچ کہتا ہے۔ تو نچنی کی طرح اتنا چٹکتی کیوں ہے؟ (اس کے بعد دوسرا عیار بلوایا جاتا ہے)۔ شمیم نے آن کر شاہ زادیوں کو دعا دے کے مجرا کیا اور گل زار نے کچھ شکایت نہ کی، بل کہ شمس النساء نے نو بہار سے کہا کہ دیکھ تو! گل زار نے بھی کچھ شمیم سے شکایت کی ہے! شمیم بولا کہ حضور! یہ مجھ سے گھل مل گئی۔ گل زار کو شمیم سے چارہ کیا ہے۔ شمیم کو لگ نہ چلنے دے تو گرفتارِ خزاں نہ ہو۔ گل زار نے تاؤ پیچ جو کھایا، غیظ سے چہرہ بہ رنگِ سرخ ہو گیا۔ شمیم بولا کہ حضور! گل زار کو مجھ سے عشق ہے۔ میری باتوں سے، خوشی کے مارے، رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ پھر تو گل زار جھاڑ کے کانٹے کی طرح شمیم کو لپٹ گئی۔ شمیم نے عرض کیا کہ حضور! یہ اپنے جوبن پر نازاں ہے، گھمنڈ سے پھولی نہیں سماتی۔

فغفور شاہ (نے) اسلام قبول کیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے حکم دیا کہ شہر میں دہائی صاحب قران اکبر کی پھیر دی جاے اور میں جس وقت شہر میں آؤں، جمیع بت خانوں کو مع اصنامِ شکستہ پاؤں، بناء مسجد، بت خانوں کی جگہ پڑی دیکھوں اور رعایا و ملازمین سے جس کو اسلام قبول نہ ہوگا، اُس کا زن و بچہ اس کے ساتھ کولھو میں پلوایا جائے گا۔

ضمیمہ ج:

غالبؔ لکھنوی کا دست یاب اُردو کلام

غزل

اُس پری پر دل جو دیوانہ ہوا — دشمنِ جاں اپنا، بے گانہ ہوا
حور بے خود ہو تجلی دیکھ کر — اُس شمع رُو پر ہوں پروانہ ہوا

بادۂ اُلفت کے پینے کے لیے ساغرِ چشم اُس کا پیمانہ ہوا
طائرِ دل دامِ کاکل میں پھنسا خال مشکیں اُس کا جو دانہ ہوا
سایۂ کاکل ہوا بارِ گراں سوسنی اُس گل کا گُل شانہ ہوا
بعد مدّت فیضِ عشقِ یار سے دل کا ہی آباد ویرانہ ہوا
دیکھیے! غالبؔ! بچے کس طرح جان دشمنِ جاں سے ہی یارانہ ہوا ۹۹

متفرّق اشعارِ غزلیات

جلد دِکھلا صورت اپنی اے مسیح! بہرِ دیدار آئی ہے آنکھوں میں جان ۱۰۰

آئینہ میں آپ نے دیکھا جو رُوئے آتشیں پڑ گئیں چنگاریاں گویا سراسر آب میں ۱۰۱

کیا ترے حُسن کی تصویر ہے، اللہ اللہ! سورۂ نور کی تفسیر ہے، اللہ اللہ! ۱۰۲

بن گئے لعل و گہر، اشک دل افگاروں کے دیدۂ زار خزانے ہوئے فوّاروں کے ۱۰۳

جب کہ روزِ وصال آتا ہے بے قراری دوچند ہوتی ہے ۱۰۴

خنجرِ مژگاں کی دِکھلا آج بُرّانی مجھے آئینہ تجھ کو مبارک، چشمِ حیرانی مجھے ۱۰۵

سلطنت سے ہے، کہیں غالبؔ میسّر ہو اگر آستانِ سرورِ عالم کی دربانی مجھے ۱۰۶

متفرق اشعارِ مثنویات

(۱)

یہ متفرق اشعار ''قصۂ امیر حمزہ'' سے نقل کیے جا رہے ہیں۔ پورے قصّے میں غالبؔ لکھنوی نے مثنوی کے اپنے جتنے شعر درج کیے ہیں، سب دو ہی بحروں میں لکھے ہوئے ہیں۔ یوں ان میں ربط موجود ہے اور یک جا صورت میں یہ مثنوی کے اشعار ہی لگتے ہیں۔ ان اشعار کا وزن ''فاعلاتن مفاعلن فعلن''، یعنی ''بحرِ خفیف مخبون محذوف'' اور ''فعولن فعولن فعولن فعول/فعل''، یعنی بحرِ

متقارب مثمن محذوف مقصور ہے۔ یہ مثنویوں کے معروف اوزان ہیں اور اُردو کی بیش تر مثنویاں انھی اوزان میں لکھی گئی ہیں۔ ۱۰۷

صانع و قادر و توانا ہے — کبریائی اُسے [ہی زیبا] ہے
ہے وہ ایسا حکیم اور دانا — کُن سے کی کائنات ہے پیدا
گِل سے کیا کیا بنائے رنگیں گُل — اُس کی صنّاعی پر ہیں شاہد گُل
منہ میں جب تک مرے زباں تر ہے — لب پہ شکرِ خدائے اکبر ہے ۱۰۸

ہے وہ ختم النبیؐ ہمارا ہی — جس کو کہتے ہیں احمدؐ عربی
کیوں نہ ہووے وہ مالکِ دَوسرا — جس کو اپنا کہے حبیب، خدا
نورِ خالق سے اُس کی خلقت ہے — فرض ہر اک پہ اُس کی طاعت ہے
ایک ادنا سی اُس کی ہے یہ سخا — نورِ ایماں ہے کفر کو بخشا
بے تمنا کہ حشر ہو جس دم — سرمرا ہوئے اُس کے زیرِ قدم ۱۰۹

عجب باغ ہے رشکِ مینو سواد — اگر دیکھے رضوان تو ہو شاد شاد
کرے یاد جنّت کی گم ایک بار — کہ دیکھی نہیں خُلد میں یہ بہار
روش در روش اور چمن در چمن — کھلے ہیں گل و لالہ و نسترن
کھلی ہے کہیں جوہی اور سیوتی — کسی سمت ہے تختہ و کیتکی
لڑاتی ہے نرگس کسی گُل سے آنکھ — ملاتا کوئی گُل ہے بُلبل سے آنکھ
کسی سمت بُلبل کے ہیں چہچہے — تذرو اِک طرف کرتے ہیں قہقہے ۱۱۰
مؤدّب ہیں استادہ سروِ چمن [کذا] — صنوبر ہیں گردِ چمن حلقہ زن
ہر اِک سرو کی شاخ پر قُمریاں — بہ الحانِ داودی کُوکو زناں ۱۱۱
لگے نخل ہیں ہر طرف میوہ دار — بہی، ناشپاتی و سیب و انار
جو ہیں تاک میں [خوشبو] زر لگے — - - - - ۱۱۲
- - - - — منڈیروں پہ کرتے کہیں شور ہیں ۱۱۳

دلارام نے چنگ میں چنگ لی
عُرد، سننے والوں کی، بس دنگ کی
نہ کیوں کرتے گم سامعیں اپنا ہوش
کہ آتی صدا چنگ سے تھی بہ جوش ۱۱۴

تولّد جو شہ زادہ اُس دم ہوا
زمانے سے یک بار گُم غم ہوا
ہوے ایسے، چھوٹے بڑے، شادشاد
کہ روشن تھا گھر گھر چراغِ مراد ۱۱۵

ہوئی بس کہ شادی میں یہ دھوم دھام
جسے دیکھ کر خوش ہوئے خاص و عام
چلا شب کو دُولھا جو تاروں کی چھانو
زچانے بھی باہر رکھا گھر سے پانو ۱۱۶
ہوئی روشنی سے شبِ تار، روز
کہ نوشہ تھا خورشیدِ عالم فروز
رواں پیشِ نوشہ تھے تختِ رواں
شہانہ تھے گاتے پری پیکراں
وہ تختوں پہ تھے تختہ تختہ چمن
شگفتہ گل و لالہ و یاسمن
فضیلت نہ کیوں دن پہ رکھتی وہ رات
کہ وہ شب حقیقت میں تھی شبِ برات
مبارک سلامت کا تھا شور و غُل
زبس شاد و خرّم خدائی تھی کُل
ہوا زر جو نوشاہ پر سے نثار
گدائے زمانہ ہوئے مال دار ۱۱۷

کرے وصف اُس اسپ کا گر رقم
صبا تک ہو نامِ کمیّت قلم ۱۱۸
کہاں پائی ختنگِ فلک نے یہ چال
کرے بادِ صرصر کو وہ پاے مال
جو لے راکبِ شیر دل اُس کی باگ
اُڑے بے پری پروہ، جس طرح ناگ ۱۱۹

اُلٹ جو دیا رُخ سے اُس نے نقاب
زمیں پہ دکھائی دیا آفتاب
ہوئی اُس سے جب چشمِ حمزہ دوچار
ہوئے غرقۂ حیرت آئینہ وار ۱۲۰

چھپر کھٹ میں بے ہوش ہو کر گری
وہ سایہ زدوں کی طرح سے پری ۱۲۱

کرے آفتاب اُس سے گر آنکھ چار
چکا چوند ہی آوے اُس بے شمار ۱۲۲
مہِ چاردہ اُس کو گر دیکھ پائے
تو وہ داغ پر داغ خجلت سے کھائے

اگر دیکھتا یوسفِ حسن سنج
تو ہاتھ اُس کا کٹتا نہ کٹتا ترنج
زُلیخا اُسے دیکھ لیتی اگر
تو یوسفؑ پہ کرتی نہ ہرگز نظر ۱۲۳

بحرِ حمزہ میں جان جاتی ہے
لب پہ سینے سے اکثر آتی ہے
موت آجائے تو میں جی جاؤں
مخلصی قیدِ رنج سے پاؤں ۱۲۴

(۲)

مثنوی کے یہ متفرق اشعار ''داستانِ عشاق'' سے نقل کیے جا رہے ہیں۔ یہ اشعار ''بحرِ متقارب مثمن محذوف مقصور'' میں یعنی ''فعولن فعولن فعولن فعول/فعل'' کے وزن پر ہیں۔ داستان کا نسخہ پیشِ نظر نہیں۔ اس کے جو اقتباسات قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں، ان میں شروع کتاب کے حصّے میں کچھ شعر نقل ہوئے ہیں۔ امکان ہے کہ ''قصّۂ امیر حمزہ'' کی طرح اس داستان میں بھی مصنّف نے اپنے شعر موقع بہ موقع درج کیے ہوں گے جو سرِ دست میسّر نہیں:

پلا مجھ کو ساقی شرابِ سخن
لکھوں نشّے میں حمدِ حق بے محن
سراپا خمِ تن میں گر جوش ہو
تو تحریر کا، حمد کی، ہوش ہو

محمدؐ کی وہ ذات ہے خوش صفات
جسے حق کہے باعثِ کائنات
پلا مجھ کو ساقی شرابِ طہور
صفت تیری لکھنی ہے مجھ کو ضرور

امامؑ دو عالم، وصیِّ رسولؐ
بنی عم نبیؐ کا ہے روحِ بتولؑ
علیؑ نام، شیرِ خدا ہے لقب
یداللہ کہتی ہے مخلوق سب ۱۲۵
کسی نشّے سے ہے نہیں مُج کو شوق
[کہ] ہے الفتِ پنج تن سے ہی ذوق

پلا مجھ کو ساقی! شرابِ خیال
لکھوں نشّے میں عاشقوں کا میں حال
کروں میں وہ عشقِ مجازی بیاں
کہ عشقِ حقیقی کا دیوے نشاں ۱۲۶

حواشی وتعلیقات:

۱ اُردو کی نثری داستانیں: ص ۲۴۹، ۲۵۰۔

۲ اُردو میں اب تک صنف کے طور پر ''داستان'' اور ''قصّے'' میں بہت ہی کم فرق کیا جاتا ہے۔ ''داستان'' کی اپنی خصوصیات ہیں اور قصّے کی اپنی۔ ایسے طویل رومان جو ''داستان'' کی دیگر خصوصیات کے حامل ہوں، ''داستان'' کہلاتے ہیں اور نسبتاً کم ضخیم اور مختصر رومان ''قصّے'' کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ''قصّہ'' کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ حکایت اور کہانی بھی رومانی افسانوں کی قسمیں ہیں۔ اردو میں ''داستان''، ''قصّہ''، ''حکایت'' اور ''کہانی'' کے درمیان صنفی طور پر کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا، یہی وجہ ہے کہ اردو قصوں اور داستانوں پر دو بنیادی نوعیت کی کتابوں: ڈاکٹر گیان چند جین کی ''اردو کی نثری داستانیں'' اور ڈاکٹر سہیل بخاری کی ''اردو داستان (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)'' میں بیش تر قصّوں اور حکایات کا تذکرہ ہے لیکن دونوں کا عنوان ''داستان'' سے متعلق ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اردو کی منظوم داستانیں'' میں بھی بیش تر اُردو قصوں کا ذکر ہے۔ اس سے ذرا کم اہم کتابیں سیّد وقار عظیم کی ''ہماری داستانیں'' اور ''داستانیں سے افسانے تک'' ہیں جن میں ایک دو مضامین کو چھوڑ کر باقی تمام مضامین اردو قصّوں اور حکایات سے متعلق ہیں، علیٰ ہذا القیاس۔

۳ ''مخطوطاتِ انجمن''، جلد چہارم، ص ۱۴، ۱۵۔

۴ میرے پیشِ نظر اس قصّے کا مطبع مفیدِ عام، لاہور سے ۱۳۲۱ھ کا طبع شدہ نسخہ ہے۔ اس کے سرِ ورق پر کتاب کا نام ''داستانِ امیر حمزہ'' درج ہے۔ اس قصّے کی دیگر اشاعتیں بھی اسی نام سے ہوئیں۔ اشکؔ نے اپنے دیباچے میں اسے ''قصّہ'' لکھا ہے۔ برٹش میوزیم لائبریری (حال برٹش لائبریری)، لندن میں اس قصّے کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جو بظاہر خود اشکؔ کا خود نوشتہ ہے۔ اس میں کتاب کا نام ''قصّۂ امیر حمزہ'' لکھا ہے۔ [Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani, Mss, P.52]
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا اصل نام ''قصّۂ امیر حمزہ'' ہے۔ اس سے امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اشاعتِ اوّل (کلکتہ، ۱۸۰۳ء) بھی اسی نام سے ہوئی ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قصّے کے لیے ''داستان'' کا عنوان بعد کی اختراع ہے اور ممکن طور پر اس کا سبب اس نام کی عوام میں مقبولیت ہے۔

۵ ڈاکٹر سہیل بخاری (سیّد محمود نقوی) کی یہ بازیافت اُن کی سَندی مقالے بہ عنوان: ''اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ'' کے ذریعے منظرِ عام پر آئی۔ اس مقالے پر اُنھیں ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹریٹ کی سند ملی [''جامعات میں اُردو تحقیق''، ص ۹۸]۔ اُن کا یہ مقالہ مارچ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ (مکمل حوالہ

کتابیات کے تحت ملاحظہ کیجیے)۔

۶۔ اردو کی نثری داستانیں: ص ۲۵۰

۷۔ ''جاہ کے طلسمِ ہوش ربا کا نادر نسخہ'': ص ۸۱، ۸۲

۸۔ اُردو کی نثری داستانیں: ص ۲۵۰، ۲۵۱

۹۔ ''طلسمِ ہوش ربا، تنقید و تلخیص''، ص ۱۶

۱۰۔ ''قصۂ امیر حمزہ'': دیباچۂ مؤلف، ص ۲، ''داستانِ عشاق''، دیباچۂ مصنف، مشمولہ: ''داستانِ عشاق''، ص ۲۶۸، اس میں نام ''امام علی خاں'' لکھا ہے۔ ظاہر ہے ''امام'' کتابت کی غلطی ہے۔ بقیہ تمام مآخذ میں نام ''امان'' ہی ملتا ہے۔

۱۱۔ ''نسخۂ دل کشا''، حصۂ اوّل، ص ۱۷۷، تذکرۂ ''معراج الخیال''، بحوالہ: ''غالبؔ کا کلکتہ''، ص ۲۰۲، ''سخنِ شعرا''، ص ۳۴۹، ''تاریخِ شعرائے بہار''، جلد اوّل، ص ۷۶، ''تذکرہ مسلم شعرائے بہار''، جلد سوم، ص ۱۷۷

۱۲۔ سببِ تالیف، ص ۲۶۸

۱۳۔ ''نسخۂ دل کشا''، حصۂ اوّل، ص ۱۷۷

۱۴۔ ''سخنِ شعرا''، ص ۳۴۹

۱۵۔ ''تاریخِ شعرائے بہار''، جلد اوّل، ص ۷۶، ''تذکرہ مسلم شعرائے بہار''، حصۂ سوم، ص ۱۷۷

۱۶۔ ''داستانِ عشاق''، سببِ تالیف، مشمولہ: ''داستانِ عشاق'' (مضمون)، ص ۲۶۸

۱۷۔ ''داستانِ عشاق'' (مضمون)، ص ۲۶۸

۱۸۔ ''قصۂ امیر حمزہ'': دیباچۂ مؤلف، ص ۲

۱۹۔ ''سخنِ شعرا''، ص ۳۴۹

۲۰۔ ''تاریخِ شعرائے بہار''، جلد اوّل، ص ۷۶، ''تذکرہ مسلم شعرائے بہار''، حصۂ سوم، ص ۱۷۷

۲۱۔ گزیٹیئر میں اس علاقے کے نام رومن میں یوں لکھے ہیں Chandranagarea, Chanderanagore گزیٹیر کے مطابق یہ صوبۂ بنگال میں فرانسیسی آبادکاروں کا علاقہ ہے۔ یہ دریائے ہوگلی (Hoogly) کے مغربی کنارے پر کلکتے سے اُوپر کی جانب سولہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس علاقے کی حیثیت ہر نسبت سے کلکتے سے بہتر ہے۔ شروع شروع میں یہ علاقہ ساحلِ دریا کے ساتھ دو میل اور ساحلِ دریا سے اندر کی طرف ایک میل کے رقبے پر مشتمل تھا۔ ۱۸۱۴ء کی مردم شماری

کے مطابق اس قصبے میں ۴۸۴، ۸ مکانات اور ۳۷۷، ۴۱ باشندے تھے۔ اس کی پہلے سال کی آمدنی ۳۲،۱۵۴ روپے تھی۔ برطانوی حکومت نے سہولتیں دے کر خفیہ طور پر اپنے زیرِ تسلط شہروں سے بہت سے لوگوں کو چندرنگر، چنسور (Chinsura) اور سیرام پور (Serampoor) بھیجا جنھوں نے وہاں سرتے کے ذریعے غیر ملکی آبادکاروں کی زمینیں خرید لیں۔ ۲۳ر مارچ ۱۷۵۷ء کو ایڈمرل واٹسن اور کرنل کلائیو کی زیرِ کمان افواج نے شدید مزاحمت اور عظیم قتلِ عام کے بعد چندرنگر پر قبضہ کیا، باقی بچ جانے والے آبادکار قلعہ بند ہو گئے اور آخر کار فرانس نے آغاز نزاع پر کسی مخالفت کے بغیر برطانوی حکومت کا قبضہ قبول کر لیا۔ ۴ر دسمبر ۱۸۱۶ء کو یہ علاقہ موسیو ڈایوٹ (Monsieur Dayot) کے سپرد کر دیا گیا جسے فرانسیسی حکومت کی جانب سے یہ ذمے داری سنبھالنے کے لیے حاکمِ اعلا کا نمائندہ مقرر کیا گیا تھا۔ یہ علاقہ ۲۳ر سال تک (۱۸۰۲ء کے چند ماہ نکال کر) برطانوی فوجی دستوں اور کارندوں کے زیرِ تسلط رہا۔["East India Gazetteer": Vol.1, PP.391,392]

۲۲۔۲۳ ''سخنِ شعرا''، ص ۳۴۹۔

۲۴ ''داستانِ عشاق''، دیباچہ مشمولہ ''داستانِ عشاق'' (مضمون)، ص ۲۶۸

۲۵ ''نسخۂ دل کشا'': حصۂ اوّل، ص ۱۷۷

۲۶ ''تاریخِ شعرائے بہار'': جلد اوّل، ص ۷۶، ''تذکرۂ مسلم شعرائے بہار''، حصہ سوم، ص ۱۷۷

۲۷ ''تاریخِ شعرائے بہار''، جلد اوّل، ص ۷۶۔

۲۸ ''قصۂ امیر حمزہ''، دیباچۂ مولف، ص ۲

۲۹ ''داستانِ عشاق'': دیباچۂ مصنف، مشمولہ: ''داستانِ عشاق'' (مضمون): ص ۲۶۹

۳۰ ''تاریخِ شعرائے بہار'': ''جلد اوّل، ص ۱۶۱

۳۱ ''سخنِ شعرا'': ص ۵۷۰

۳۲ ان معرکوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: ''غالبؔ کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کے ادبی معرکے'': از ڈاکٹر خلیق انجم، اشاعتِ اوّل، ۲۰۰۵ء، نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، اشاعتِ دوم، ۲۰۰۶ء، کراچی، انجمن ترقی اردو، پاکستان۔

۳۳ یہ مضمون پہلے ماہ نامہ ''ماہِ نو''، کراچی، بابت فروری ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ بعد میں یہی مضمون ماہ نامہ ''ماہِ نو'' کراچی کے ''غالب نمبر''، بابت جنوری و فروری ۱۹۶۹ء (ص ۵۱ تا ۵۵) اور حمید احمد خاں کے مجموعۂ مضامین: ''مرقّعِ غالبؔ''، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۳ء (ص ۱۸۶ تا ۲۰۳) میں بھی شامل ہوا۔

۳۴ ''غالب کا کلکتہ''، ماہ نامہ ''ماہِ نو''، غالب نمبر، ص ۵۵، ''مرقّعِ غالب''، ص ۲۰۰۔

۳۵ حمید احمد خاں کے الفاظ ہیں: ''اس نسخے کا سالِ تحریر ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء ہے''۔ [ایضاً: ص ۲۰۲]

۳۶ حمید احمد خاں کے الفاظ ہیں: ''کلکتے کے بڑے سرکاری کتب خانے کے اُس حصّے میں جو بہار لائبریری کہلاتا ہے''۔ [ایضاً]

یہ نیشنل لائبریری کلکتہ کا ذکر ہے اور اس میں شامل ایک ذخیرے کا نام ''بوہار لائبریری'' تھا جو بعد میں ''بہار کلکشن'' کہلانے لگا۔ [''اُردو مخطوطات کی فہرستیں (رسائل میں)'': جلد اوّل، ص ۱۳۱]۔ اسے ''بہار'' لکھنا یقیناً کتابت/کاتب کی غلطی ہے۔ اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے رجوع کیجیے: ''کلکتہ اور اطرافِ کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ اردو مخطوطات'': مشمولہ: (۱) ''ارمغانِ علمی، بہ خدمت ڈاکٹر وحید قریشی''، لاہور، القمر انٹر پرائزز، طبع اوّل، ۱۹۹۸ء (۲) ''اُردو مخطوطات کی فہرستیں (رسائل میں)''، جلد اوّل (مکمل حوالہ ''کتابیات'' میں)۔

۳۷ ''غالب کا کلکتہ''، مشمولہ ''مرقّعِ غالب''، ص ۲۰۲

۳۸ ''غالب اور بنگال''، ص ۵۷

۳۹ ''غالب سے معاصرین کی چھیڑ چھاڑ''، ص ۷۷

۴۰ ''بنگال میں غالب شناسی''، ص ۳۰

۴۱ ''غالب کا کلکتہ''، مشمولہ: ''مرقّعِ غالب''، ص ۲۰۲

۴۲ تفصیل کے لیے رجوع کیجیے: ''غالب اور معارضۂ کلکتہ''، ص ۹۹ تا ۱۰۱

۴۳ ''سخنِ شعرا''، ص ۳۴۹

۴۴ ''تاریخِ شعرائے بہار'': جلد اوّل، ص ۷۶، ''تذکرۂ مسلم شعرائے بہار''، حصّۂ سوم، ص ۱۷۷

۴۵ ''مرزا محمد حسن قتیل اور صفت تماشا''، ص ۱۱۹

۴۶ ایضاً، ص ۱۲۶، ۱۲۷

۴۷ ''داستانِ عشاق'': دیباچہ، مشمولہ: ''داستانِ عشاق'' (مضمون): ص ۲۶۹

۴۸ ''نسخۂ دل کشا''، ص ۱۷۸، ''سخنِ شعرا''، ص ۳۴۹، ۳۵۰

۴۹ صفحہ دریدہ ہونے کے باعث یہ آخری دو لفظ ضائع ہو گئے ہیں۔

۵۰ ''داستانِ امیر حمزہ''، باتصویر: دیباچہ، ص ۲

۵۱ میرے پیشِ نظر اس قصّے کا مطبع مفیدِ عام، لاہور سے ۱۳۲۱ھ کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ اس کے سرِ ورق پر کتاب کا نام ''داستانِ امیر حمزہ'' درج ہے۔ اس قصّے کی دیگر اشاعتیں بھی اسی نام سے ہوئیں۔ قصّے کی پہلی اشاعت ۱۸۰۵ء میں کلکتے سے ہوئی جو از حد کم یاب ہے۔ معلوم نہیں اس میں کتاب کا نام ''قصّۂ امیر حمزہ'' ہے یا ''داستانِ امیر حمزہ''۔ اشکؔ نے اپنے دیباچے میں اسے ''قصّہ'' لکھا ہے۔ اس کے علاوہ برٹش میوزیم (حال برٹش لائبریری)، لندن میں اس قصّے کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جو بظاہر اشکؔ کا خود نوشتہ ہے۔ اس میں کتاب کا عنوان ''قصّۂ امیر حمزہ'' لکھا ہے۔ [Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts in the Library of the British Museum, P.52] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا اصل نام ''قصّۂ امیر حمزہ'' ہی ہے۔ امکان ہے کہ اس کی اشاعتِ اوّل بھی اسی نام سے ہوئی ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے ''داستانِ امیر حمزہ'' کا عنوان بعد کی اختراع ہے اور اس کا سبب اس عنوان کی عوام میں مقبولیت معلوم ہوتی ہے۔

۵۲ ''اردو داستان (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)''، ص ۲۳۱ تا ۲۳۸

۵۳، ۵۴ ایضاً، ص ۲۳۲

۵۵ ''اُردو کی نثری داستانیں''، ص ۲۶، ۷

۵۶ اس نسخے کا فہرست (کیٹلاگ) نمبر ''۴۳۳، ۸۹۱، ق ۹۶۳'' ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل یہ نسخہ ''عربک سیکشن'' میں تھا اور اس کا نمبر "ui ix 24" اور فہرست نمبر ۶۷۴۵ تھا۔

۵۷ ''قصّۂ امیر حمزہ'' کے فرانس پریچٹ کے ملکیتی نسخے سے متعلق فاضل دوست پاشا محمد خاں (طالبِ علم پی ایچ۔ڈی اُردو، شعبۂ مطالعاتِ مشرقِ وسطیٰ، شمالی ہند اور افریقا، مرکزِ تقابلی ادب و معاشرہ، کولمبیا یونیورسٹی، امریکا) نے اپنی ای میل مورخہ ۲۱ جنوری ۲۰۱۱ء میں مجھے درج ذیل معلومات ارسال کیں:

۵۸ ''اردو داستان (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)''، ص ۲۹۸ تا ۳۱۰

۵۹ ''اردو کی نثری داستانیں''، ص ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۸، ۷

۶۰ ''طلسمِ ہوش ربا، تنقید و تلخیص''، ص ۱۵، ۱۶

۶۱ ''اُردو کی نثری داستانیں''، ص ۶۹۳

۶۲ ''طلسمِ ہوش ربا، تنقید و تلخیص''، ص ۱۹

۶۳ ''داستانِ عشّاق''، دیباچہ، مشمولہ: ''داستانِ عشّاق'' (مضمون)، ص ۲۶۸، ۲۶۹

۶۴ ''داستانِ عشّاق'' (مضمون): مکمل حوالہ کتابیات میں ملاحظہ کیجیے۔

۶۵ ایک جُزو ۱۶ صفحات یا ۱۶، ورق پر مشتمل ہوتا ہے۔ قاضی صاحب اور اُن کے بھائی قاضی محمد سعید نے مخطوطے کی تقطیع درج نہیں کی ورنہ وضاحت ہو جاتی۔ بڑی تقطیع میں ایک جزو عموماً ۱۶ صفحات کا اور چھوٹی تقطیع میں ۳۲ صفحات کا ہوتا ہے۔

۶۶ ''فہرستِ نمایش ادارۂ تحقیقاتِ اردو''، ص ۶

۶۷ اصل: پے

۶۸ یہاں سے صفحہ دریدہ ہے جس کے باعث دو الفاظ ضائع ہو گئے ہیں۔ تصحیح قیاسی کے ذریعے ممکنہ لفظ لکھے گئے ہیں۔ آئندہ بھی لمبے قوسین میں درج الفاظ تصحیح قیاسی کے ذریعے لکھے گئے ہیں۔

۶۹ اصل: میرے، جو وزن میں نہیں آتا۔

۷۰ عکس میں یہ لفظ صاف نہیں پڑھا جاتا۔

۷۱،۷۲ اصل: کئے۔

۷۳ اصل: ہر ایک پر؛ ''ایک'' اور ''پر'' سے وزن پورا نہیں رہتا

۷۴ اصل: میرا؛ وزن سے خارج

۷۵ سات سو۔

۷۶ اصل: ہے اُلفتِ پنجتن سے ہے ذوق۔

۷۷ اصل: پر۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

۷۸ اصل: عبث عبث۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

۷۹،۸۰ لمبے اور گول قوسین کے اندر کی عبارت صاحبِ مضمون یعنی قاضی عبدالودود کی ہے۔ اس میں غالباً اُنھوں نے آئندہ واقعات کا ملخص بیان کیا ہے۔

۸۱ قاضی صاحب نے ''پیا'' کے بعد ''(کذا)'' لکھا ہے، حالاں کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حقّہ پینے کا ذکر ہے۔

۸۲ ''باپ دادے'' کے آگے بھی ''(کذا)'' درج ہے۔

۸۳ اگر یہ لفظ اسی طرح ہے اور صحیح نقل ہوا ہے تو اسے ''انگلیس'' یا ''انگلش'' کی تصغیر سمجھنا چاہیے اور اس کا معنیٰ بظاہر انگریزی حکام کا وظیفہ، یعنی ''پنشن'' ہونا چاہیے۔ سیاق و سباق سے بھی یہی مطلب اخذ ہوتا ہے۔

۸۴ ''اپنی سونا'' کے آگے ''(کذا)'' تحریر ہے۔

۸۵ ''گھوڑے کی گھاس'' کے آگے بھی ''(کذا)'' تحریر ہے۔

۸۶ لتّی کرنا: بھاگ جانا [''علمی اُردو لغت (جامع)''، ص ۱۲۸۷]۔

۸۷ غالباً ''چیتنا'' (بہ یائے معروف)، بمعنی ''خواہش کرنا'' [''علمی اردو لغت (جامع)''، ص۶۳۴] کا حاصلِ مصدر سے مشتق۔

۸۸ اصل: پرنژاد۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

۸۹ اصل: صاحبِ قرآن۔ بظاہر کتابت کی غلطی ہے۔

۹۰ اصل: دھن۔

۹۱ ''آواز نکلتی تھی؛ نکالا'' کے بعد ''(کذا)'' درج ہے، جب کہ جملے میں کہیں کوئی سقم نظر نہیں آتا۔

۹۲ اصل: خنک۔ بظاہر کتابت کی غلطی۔

۹۳ ''بلیچ'' کے بعد ''(کذا)'' تحریر ہے۔

۹۴ ''نرکھ'' کے بعد بھی ''(کذا)'' درج ہے۔

۹۵ ''چڑھ باجے'' کے بعد بھی ''(کذا)'' درج ہے۔ ترکیب واضح ہے۔

۹۶ اصل: ''تیری ماتا پتا''۔

۹۷ ''ڈیڑھ'' کے آگے بھی ''(کذا)'' لکھا ہے۔

۹۸ اصل: ''کوڑہ پنی (کذا)''۔ ظاہر ہے یہ ناقل کی غلطی ہے۔ یہاں قدیم املا کی درست خواندگی نہیں ہوئی، اس لیے ناقل کو ''(کذا)'' لکھنا پڑا۔

۹۹ ''قصۂ امیر حمزہ'': ص۹۵، ۹۶۔

۱۰۰ ایضاً: ص۹۵۔

۱۰۱ ''سخنِ شعرا'': ص۳۴۹۔

۱۰۲ ''قصۂ امیر حمزہ'': ص۳۸۵۔

۱۰۳ ''سخنِ شعرا'': ص۳۵۰، ''نسخۂ دل کشا'': ''حصۂ اوّل، ص۱۷۸؛ ''تاریخِ شعرائے بہار'': جلد اوّل، ص۷۶؛ ''تذکرۂ مسلم شعرائے بہار'': حصۂ سوم، ص۱۷۷۔

۱۰۴ ''قصۂ امیر حمزہ'': ص۳۷۴۔

۱۰۵ ''سخنِ شعرا''، ص۳۵۰۔

۱۰۶ ایضاً: حاشیہ ۱۰۳۔

۱۰۷ ''علمِ عروض اور اردو شاعری''، ص۳۰۲، ۳۰۵۔

۱۰۸ ''قصۂ امیر حمزہ''، دیباچہ، ص۱۔

۱۰۹ ایضاً،ص۱،۲
۱۱۰ اصل: ایک؛لیکن اس سے وزن پورا نہیں رہتا۔
۱۱۲ ورق کا اوپر کا حصّہ دریدہ ہونے کے باعث یہ دو مصرعے ضائع ہوے۔
۱۱۳ ''قصّہ ٔ امیر حمزہ'':ص۱۰،۱۱۔
۱۱۴اور۱۱۵ ایضاً،ص۲۴۔
۱۱۶ اصل: دولہ۔
۱۱۷ ''قصّہ ٔ امیر حمزہ''،ص۲۸
۱۱۸ اصل: تگ؛کتابت کی غلطی ہے۔
۱۱۹ ''قصّہ ٔ امیر حمزہ'':ص۴۷۔
۱۲۰ ایضاً،ص۵۳
۱۲۱ ایضاً،ص۹۰۔
۱۲۲ اصل: ''چکا چوندہی آوے اوسے بے شمار''۔''اُسے'' سے مصرع بے وزن ہو جاتا ہے۔
۱۲۳ ''قصّہ ٔ امیر حمزہ'':ص۹۱۔
۱۲۴ ایضاً،ص۱۷۷۔
۱۲۵ لمبے قوسین میں درج الفاظ قیاسی تصحیح سے لکھے گئے ہیں۔ان کے بغیر مصرعوں کا وزن پورا نہیں ہوتا۔
۱۲۶ ''داستانِ عشاق'': دیباچہ وآغازِ داستان،مشمولہ:''داستانِ عشاق''(مضمون):ص۲۶۸،۲۶۹۔

فہرستِ اسنادِ محولہ

۱۔ ارمانؔ،جسے جے متر:''نسخہ ٔ دل کشا''،حصّہ ٔ اوّل،اشاعتِ اوّل،کلکتہ،گنیش پریس،۱۸۷۰ء۔
۲۔ امروہوی،افسر صدیقی:''مخطوطاتِ انجمن''،جلد چہارم،اشاعت اوّل،کراچی،انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء۔
۳۔ خاں،حمید احمد،پروفیسر:''مرقّعِ غالبؔ''،بارِ اوّل،لاہور،مجلسِ ترقی ادب،۲۰۰۳ء۔
۴۔ خلیق انجم،ڈاکٹر:''غالبؔ کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کے ادبی معرکے''،اشاعتِ اوّل،نئی دہلی،غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۵ء،اشاعتِ دوم،کراچی،انجمن ترقی اُردو،۲۰۰۶ء۔
۵۔ دہلوی،اشکؔ،خلیل علی خاں:''داستانِ امیر حمزہ''،لاہور،مطبعِ مفیدِ عام،۱۹۰۴ء۔
۶۔ سہرامی،کلیم،ڈاکٹر:''بنگال میں غالبؔ شناسی''،اشاعتِ اوّل،ڈھاکا،کلچرل اکیڈمی،۱۹۹۰ء۔

۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر: ''اُردو داستان (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)''، طبع اوّل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء۔
۸۔ شاہد، رفاقت علی: مرتب ''اُردو مخطوطات کی فہرستیں (رسائل میں)''، جلد اوّل، اشاعتِ اوّل، لاہور، اُردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۰ء۔
۹۔ ضیاء، محمد اسلم، ڈاکٹر: ''علمِ عروض اور اُردو شاعری''، طبعِ اوّل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء۔
۱۰۔ عبدالودود، قاضی: ''اُردو شعر و ادب؛ چند مطالعے''، پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، (اشاعتِ اوّل)، ۱۹۹۵ء۔
۱۱۔ عظیم آبادی، رازؔ، سیّد، عزیز الدین احمد بلخی: ''تاریخِ شعرائے بہار''، جلد اوّل، طبعِ اوّل، بانکی پور پٹنہ، مطبوعہ: دی قومی پریس، باہتمام: مولوی عطاء الرحمٰن، ۱۹۳۱ء۔
۱۲۔ فاروقی، شان احمد، ڈاکٹر: ''دراسات''، طبع اوّل، دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۸ء۔
۱۳۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر: ''اُردو کی منظوم داستانیں''، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۰ء۔
۱۴۔ فریدی، قمر الہدیٰ، ڈاکٹر: ''طلسمِ ہوش ربا؛ تنقید و تلخیص''، اشاعتِ اوّل، علی گڑھ، ناشر مصنف، ۱۹۹۹ء۔
۱۵۔ قادری، ایوب محمد، ڈاکٹر: ''غالبؔ اور عصرِ غالبؔ''، بارِ اوّل، کراچی، غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۸۲ء۔
۱۶۔ گارساں دتاسی: ''خطباتِ گارساں دتاسی''، حصّۂ اوّل: ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۴ء؛ (پانچواں خطبہ بابت ۱۸۵۴ء)؛ مترجم: مسز پکھتال؛ نظرِ ثانی: ڈاکٹر حمید اللہ، اشاعتِ ثانی، کراچی، انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۹ء۔
۱۷۔ گیان چند، ڈاکٹر: ''اُردو کی نثری داستانیں''، لکھنؤ، اُتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء۔
۱۸۔ لکھنوی، غالبؔ، امان علی خاں، مرزا: ''قصّۂ امیر حمزہ''، اشاعتِ اوّل، کلکتہ، مطبع امدادیہ حکیم محتشم الیہ، ۱۸۵۵ء۔
۱۹۔ محمد سعید، قاضی: ''فہرستِ نمایش''، اشاعتِ اوّل، پٹنہ، ادارۂ تحقیقاتِ اُردو، ۱۹۵۹ء۔
۲۰۔ ندوی، احمد اللہ، سیّد حکیم: ''تذکرۂ مسلم شعرائے بہار''، حصّۂ سوم، اشاعتِ اوّل، کراچی، س ن [۱۹۶۸ء]۔
۲۱۔ نساخ، عبدالغفور خاں: ''سخنِ شعرا'' (عکسی اشاعت)، لکھنؤ، اُتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۲ء۔
۲۲۔ وقار عظیم، سیّد: ''ہماری داستانیں''، رام پور، مکتبۂ عالیہ، ۱۹۶۸ء۔
۲۳۔ وقار عظیم، سیّد: ''داستان سے افسانے تک''، دہلی، طاہر بک ایجنسی، ۱۹۷۲ء۔
۲۴۔ ہاشمی، رفیع الدین، عارف نوشاہی، تحسین فراقی، مرتبین: ''ارمغانِ علمی، بہ خدمت ڈاکٹر وحید قریشی''، طبع اوّل، لاہور، القمر انٹر پرائزز، ۱۹۹۸ء۔

۲۵۔ ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر: ''جامعات میں اُردو تحقیق'' اشاعتِ اوّل، اسلام آباد، ہائر ایجوکیشن کمیشن، ۲۰۰۸ء۔

۲۶۔ Blumdhardt, J.F: Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts in the Library of the British Museum; 1899; London, Longmans & Co.

۲۷۔ Walter Hamilton: East India Gazetteer, Vol.2, (1828); Reproduce 1993; Delhi, Low Prince Publications.

رسائل:

۱۔ ماہ نامہ ''ماہِ نو''، کراچی، فروری ۱۹۵۰ء، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء۔

۲۔ ماہ نامہ ''سب رس''، حیدر آباد دکن، نومبر ۱۹۵۹ء۔

۳۔ خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ، شمارہ ۱۱۶، جون ۱۹۹۹ء۔